المنار

تعلیم الاسلام کالج ربوہ

اکتوبر ۱۹۷۱ تا جون ۱۹۷۲ء

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

لہایت افسوس اور دلی رنج و غم کے ساتھ لکھا جاتا ہے کہ تعلیم الاسلام کالج ربوہ کے ہونہار طالب علم شاھد انوار گذشتہ دنوں فضل عمر ہوسٹل میں اچانک وفات پاگئے اناللہ وانا الیہ راجعون ۔

مرحوم ایف ۔ ایس سی (پری ،میڈیکل) کے طالب علم تھے اور نہایت ھنس مکھ ، سعیدالطبع اور خلیق نوجوان تھے ۔ بلڈ پریشر کے عارضہ میں مبتلا تھے اسی وجہ سے والدین اور ڈاکٹروں کے اصرار پر سکینڈایر میں دو سال کا وقفہ بھی کیا ۔ مورخہ یکم جون ۱۹۷۲ء کو خون کے دباؤ کی وجہ سے دماغ کی رگ پھٹ گئی اور بے ہوش ہو گئے اور اسی حالت میں دو گھنٹے تک ڈاکٹروں کی کوششوں کے باوجود عین عالم شباب میں داعی اجل کو لبیک کہا ۔ ع

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے ۔

مرحوم منڈی بہاؤالدین کے رہنے والے تھے ۔ چنانچہ اسی روز آپ کا جنازہ منڈی بہاؤالدین پہنچایا گیا جہاں تجہیز و تکفین عمل میں آئی ۔ مرحوم کی اچانک وفات پر محترم محمدعلی صاحب چوھدری (پرنسپل) کی زیر صدارت کیمسٹری تھیٹر میں طلباء کا ایک ہنگامی اجلاس ہؤا ۔ جس میں ایک قرار داد تعزیت پیش کی گئی ۔ اور مرحوم کے والدین اور اعزہ و اقارب سے اظہار افسوس کیاگیا ۔ مرحوم کی وفات کے اگلے روز محترم پرنسپل صاحب منڈی بہاؤالدین تشریف لے گئے اور مرحوم کے والدین کے رنج و غم میں شریک ہوئے ۔ ادارہ المنار اس سانحہ جانکاہ پر مرحوم کے والدین اور عزیزوں کے دکھ اور درد میں برابر کا شریک ہے اور دعاگو ہے کہ اللہ تعالی انہیں صبر جمیل عطا فرمائے اور انکے زخمی دلوں پر اپنی رحمت کا پھایہ رکھے (آمین)

(ادارہ المنار)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

روشنی اور رفعت کا نشان

المنار

سہ ماہی مجلّہ

تعلیم الاسلام کالج ربوہ

جلد ۲۱	اکتوبر ۱۹۷۱ء تا جون ۱۹۷۲ء	شمارہ ۲، ۱

سرپرست

پروفیسر محمد علی چوہدری ایم۔اے (پرنسپل)

نگران

پروفیسر سعود احمد خان ایم۔اے۔

ادارۂ تحریر

مدیر اعلیٰ

عبدالکریم خالد

مدیر

محمد داؤد منیر

نائبین

مسعود احمد خان۔ خواجہ عبدالحمید۔ طاہر احمد

لطف الرحمٰن

(جنید ہاشمی پبلشر نے ضیاء الاسلام پریس ربوہ سے چھپوا کر تعلیم الاسلام کالج ربوہ سے شائع کیا)

ترتیب

قال الرسولؐ — احادیث النبی صلی اللہ علیہ وسلم

افکارِ عالیہ — حضرت حافظ مرزا ناصر احمد (خلیفۃ المسیح الثالث)

اداریہ — خود اقرار کریں اپنے روبرو ہو کر

پند و نصائح — طلبہ کی ذمہ داری — حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمدؓ

تاریخ اسلام — مسلمانوں کی فتوحات — ع ۔ ک ۔ خ

شخصیات — قاضی محمد اسلم صاحب ایم اے (کینٹب) — عبد الباری قیوم

تصنیفات و تالیفات — ہزاروں علم کے موتی — پروفیسر مسعود احمد خان ایم۔ اے

تاریخ ادب اُردو — تذکرہ رسائل قدیم کا — طاہر احمد خان

افسانے — تحفہ — تنویر احمد خان

زود پشیماں — اعجاز الحسن گیلانی

غزلیات — احسان دانش ۔ سجاد باقر رضوی ۔ خالد آفاقی ۔ عاصم صحرائی

مجاہدانہ کارنامے

چومتا ہے جن کی پیشانی کو جھک کر آسماں — بشیر طارق

روشن ستارے — محمد داؤد منیر

منظومات — ثاقب زیروی

ڈاکٹر پرویز پروازی

شبیر شاہد

رشید شاہد

پارہ ہائے جگر — طلبائے کالج

حصۂ عربی — نسخ قرآن — پروفیسر محمد عثمان صدیقی ایم اے

الانسان والکون — ایوب اقبال احمد

علم و عمل

علم و عمل

قال الرّسُول

احادیث النبی صلی اللہ علیہ وسلم

پسندیدہ اعمال

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ کو کون سا عمل پسند ہے؟ حضورؐ نے فرمایا کہ نماز وقت پر پڑھنا۔ میں نے عرض کیا کہ اس کے بعد؟ فرمایا: ماں باپ سے نیکی کرنا۔ میں نے عرض کیا پھر کون سا؟ فرمایا: جہاد فی سبیل اللہ۔ (مسلم)

تین نیک خصلتیں

حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تین خصلتیں ایسی ہیں کہ جس میں موجود ہوں وہ ایمان کی حلاوت پاتا ہے۔ اوّل یہ کہ اللہ اور اُس کے رسول کے ساتھ محبت باقی سب چیزوں سے بڑھ کر ہو۔ دوسرے یہ کہ کسی نیک انسان سے محض اللہ کی خاطر محبت ہو۔ تیسرے یہ کہ کفر سے نجات پانے کے بعد پھر اُس کی طرف لوٹنا اُسے بہت ہی بُرا معلوم ہو۔ (بخاری)

حُسنِ سیرت

حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ تعالےٰ نے تمہارے جسم اور تمہاری صورتیں نہیں دیکھتا بلکہ اُس کی نظر تمہارے دلوں پر ہے۔
(مسلم)

نیکی اور بدی کی پہچان

وابصہ بن معبد راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نیکی وہ ہے جس پر تیرا قلب مطمئن ہو اور تیرا نفس تسلّی پکڑے اور گناہ وہ کام ہے جس سے تیرے دل میں کھٹکا، خلجان اور اضطراب ہو۔ خواہ اسے کرنے کا لوگ تجھے فتویٰ بھی دیدیں۔ (مسند احمد بن حنبلؒ)

افکارِ عالیہ

جماعتِ احمدیہ کے موجودہ امام اور ہمارے کالج کے سابق پرنسپل حضرت حافظ مرزا ناصر احمد صاحب ایم اے (آکسن) نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں اشعار بھی کہے ہیں۔ اُس دَور کے چند اشعار درج ذیل کئے جاتے ہیں۔

(ادارہ)

زندہ خدا سے دل کو لگاتے تو خوب تھا
مُردہ بُتوں سے جان چُھڑاتے تو خوب تھا
قصّے کہانیاں نہ سُناتے تو خوب تھا
زندہ نشان کوئی دکھاتے تو خوب تھا
اپنے تئیں جو آپ ہی مُسلم کہا تو کیا
مُسلم بنا کے خود کو دکھاتے تو خوب تھا
تبلیغِ دین میں لگا دیتے زندگی
بے فائدہ نہ وقت گنواتے تو خوب تھا
دُنیا کی کھیل کُود میں ناصر پڑے ہو کیوں
یادِ خدا میں دل کو لگاتے تو خوب تھا

اداریہ

خود احتساب کریں اپنے روبرو ہو کر

پاکستان پر عظیم سانحہ گزر گیا —— مدھر دریاؤں، گنگناتے مانجھیوں، سُنہرے پٹ سن اور روپہلی دھان کی سرزمین دشمن کی ناپاک عصبیت کا شکار ہو کر رہ گئی —— بھارتی درندے دندناتے اِس سرزمینِ پاک میں داخل ہوئے اور —— یہ خطۂ ارض —— جس کی حُرمت کا ہمیں دعویٰ تھا، بے گناہ محبِ وطن شہریوں کے لہو سے لالہ گوں ہو گیا —— رائفلوں کی سنگینوں نے معصوم بچّوں کو جینے کی مہلت نہ دی —— وہ اُدھر خاک و خون میں لوٹتے رہے —— ہم اِدھر ہاتھ مَلتے رہ گئے —— عالمِ اضطراب میں ہم سڑکوں پر نکل آئے —— خوب واویلا کیا، مگر کچھ بن نہ آئی —— انصاف طلبی سے متعلق ہماری تمام آوازیں انجمنِ اقوامِ عالم کے بلند و بالا ایوانوں میں گھُٹ کر رہ گئیں —— وہ اصول جن کی تقدیس کا چرچا ہم اکثر سُنتے تھے، سرِ محفل دم توڑ گئے —— انسانیت کی حرمت و تکریم کے تذکرے بے سُود ثابت ہوئے —— کیسا ستم ہُوا —— !! مسلمانوں کی درخشندہ و تابندہ روایات کا ایک عظیم باب اُٹھ گیا ——

یہ درست ہے کہ وہ سب کچھ ہو چکا جس کے تصوّر سے رُوح لرزتی تھی —— لیکن جو عمل اور صبر بھی تو کوئی چیز ہے —— مشکل آن پڑے اور آدمی حوصلہ بلند اور —— حواس بجا رکھے اور خدا پر بھروسہ کر کے جہد آزما ہو تو وہ مشکل آسان ہو جاتی ہے —— یہ اصول قوموں پر بھی صادق آتا ہے —— ایک حقیقی مسلمان کی یہ شان ہے کہ وہ کبھی حوصلہ نہیں ہارتا —— مصائب و مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے —— ناکامیوں کے باوجود مسکراتا ہے —— کیونکہ مصائب و مشکلات اور ناکامیاں ہی دراصل کامیابیوں کا پیش خیمہ ہوتی ہیں ؎

تُندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اُڑانے کے لئے

ہماری اِس غیر متوقع ناکامی نے ہمیں اُن عظیم ذمّہ داریوں سے رُوشناس کیا ہے جنہیں ہم تقریباً بھُلا چکے

تھے ـــــ ہمیں اب احساس ہُوا ہے کہ ہم صراطِ مستقیم سے بھٹک گئے تھے ـــــ ہمیں اب علم ہُوا ہے کہ مسلمان خدا کے حکموں کو ٹال کر کبھی فلاح و کامیابی کا راستہ نہیں دیکھ سکتا ـــــ اب ہمیں ماضی سے سیکھنا ہوگا ـــــ اپنی گزشتہ کوتاہیوں اور غلطیوں سے تائب ہو کر از سرِ نو منظم ہونا ہوگا ـــــ ہمیں اِس عارضی ناکامی اور شکست کو دائمی اور حتمی فتح میں بدلنا ہوگا ـــــ ہمیں مشرقی پاکستان کے محبِ وطن شہریوں کو ظلم و جَور سے نجات دلانا ہوگا ـــــ لیکن شرط یہ ہے کہ ہم خدا کے قدوس کے سامنے سجدہ ریز ہوں اور ـــــ خدائے لم یزل سے نصرت و مدد کے طلبگار ہوں کیوں کہ اِنْ یَّنْصُرْکُمُ اللّٰہُ فَلَا غَالِبَ لَکُمْ وَ اِنْ یَّخْذُلْکُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِیْ یَنْصُرُکُمْ مِّنْ بَعْدِہٖ وَعَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ (آل عمران ، ۱۶۱) اگر اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کرے تو تم پر کوئی غالب نہیں (آسکتا) اور اگر وہ تمہاری مدد چھوڑ دے تو اُسے چھوڑ کر کون ہے جو تمہاری مدد کرے گا اور مومنوں کو اللہ پر (ہی) توکل کرنا چاہیئے ـــــ نجات و کامیابی کا راستہ ایک ہی ہے کہ ربِ قدوس کے حضور سرِ نیاز خم کیا جائے۔ وَھُوَ خَیْرُ النّٰصِرِیْن اور وہ سب مدد کرنے والوں سے بہتر ہے۔ اگر ہماری تضرعات اور گریہ و زاری کے صلے میں ہمیں خدا کی نصرت و تائید حاصل ہوگئی تو ؎

ٹوٹیں گے ظلم و جَور کے اصنام دیکھنا
دے گا شکست کفر کو اسلام دیکھنا

بانیٔ پاکستان قائدِ اعظم محمد علی جناح نے ایک موقع پر طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا :-

"آپ میں سے ہر شخص کو دفاعِ وطن کو مضبوط بنانے میں اپنا کردار ادا کرنا ہے۔ آپ کا نصب العین ایمان، تنظیم اور ایثار ہونا چاہیئے۔ اگرچہ آپ کی تعداد کم ہے لیکن آپ کو ہمت اور فرض کی بے لوث ادائیگی سے اپنی عظمت جتانی ہوگی۔ کیونکہ خالی خولی زندگی کوئی معنی نہیں رکھتی بلکہ ہمت، جرأت اور عزمِ صمیم ہی اسے دوام بخشتے ہیں۔"

ہم مکتبو! قائدِ اعظم کا یہ ارشاد ہمارے لئے مشعلِ راہ ہے۔ اِس کی روشنی میں ہمیں اپنی منزل کا تعین کرنا ہے جس کے لئے ہم نے رختِ سفر باندھا ہے۔ صدرِ پاکستان جناب ذوالفقار علی بھٹو نے ایک مرتبہ حیدر آباد یونیورسٹی کے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "اِس وقت آپ کے سامنے سب سے اہم مقصد تعلیم ہے۔ آپ کو چاہیئے کہ اِن نازک وقت میں آپ اپنی تمام صلاحیتیں اور استعدادیں تعلیم پر مرکوز کریں ـــــ تاکہ آپ اُس منزل کو جلد پالیں جس کے لئے آپ کو شاں ہیں" ـــــ بانیٔ پاکستان اور صدرِ پاکستان کے ارشادات کو پیش کرنے کے بعد ہمارے کچھ کہنے کی گنجائش باقی نہیں

رہتی ـــــ امید ہے کہ آپ اِن اقوال پر ضرور کان دھریں گے ـــــ !!

کچھ پرچے کے متعلق ـــــ

حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد المصلح الموعودؓ ایک عظیم مفکر، مدبر اور عالم دین تھے۔ آپ نے تعلیم الاسلام کالج لاہور کے سالانہ جلسہ عطائے اسناد میں پاکستان کی تعمیر و ترقی کے لئے طلبہ کو جو گرانقدر نصائح فرمائی تھیں ـــــ المنار کے زیر نظر شمارے میں پیش کی جا رہی ہیں۔ حضورؓ کی یہ نصائح موجودہ حالات کے عین مطابق ہیں ـــــ طلباء کو اِن بابرکت نصائح پر دل و جان سے عمل پیرا ہونا چاہیئے۔

سنہ ۱۹۷۱ء کے اواخر میں ہمارے ملک کو جس حادثۂ عظیم سے دوچار ہونا پڑا ہے اس سے ہمارے قلب و ذہن بُری طرح متاثر ہیں۔ مسلمان نہایت شاندار روایات کے حامل تھے۔ جن کی بہادری اور جاں نثاری کا لوہا ایک دنیا مانتی تھی۔ ہماری ناکامی کا بڑا سبب یہی ہے کہ ہم نے اپنے اسلاف کی عظیم روایات سے انحراف کیا ـــــ موجودہ شمارے میں مسلمانوں کی درخشندہ و تابندہ روایات اور عظیم فتوحات کا خاکہ تاریخ کے آئینے میں پیش کیا گیا ہے ـــــ استاذی المحترم پروفیسر ڈاکٹر پروین پروازی کی نظم بھی انہی عظیم روایات کی آئینہ دار ہے۔ ثاقب زیروی کی نظم 'عزم نو' ہر پاکستانی کے دل کی آواز ہے ـــــ ع

جو عہد صحرائیوں نے باندھا تھا پھر استوار ہوگا

مسلمانوں نے نہ صرف میدانِ حرب میں عدیم المثال کامیابیاں حاصل کی ہیں بلکہ علمی اور تحقیقی میدان میں بھی انہوں نے وہ شاندار ترقیات حاصل کی ہیں جن کی مثال ڈھونڈے سے ملنی مشکل ہے۔ استاذی المحترم پروفیسر مسعود احمد خان کا مرتبہ مضمون "ہزاروں علم کے موتی" اس امر پر شاہد ناطق ہے۔ طاہر احمد خان کا تحریر کردہ مضمون "تذکرہ رسائل قدیم" میں اُن اردو اخبارات و رسائل کا ذکر ہے جو آج ناپید ہیں ـــــ علمی اور معلوماتی مضمون ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے ـــــ حضرت قاضی محمد اسلم صاحب ایم۔ اے (کینٹب) ہمارے کالج کے سابق پرنسپل ہیں۔ آپ نے سنہ ۱۹۶۵ء سے سنہ ۱۹۷۰ء تک تعلیم الاسلام کالج کے پرنسپل کے فرائض انجام دیئے۔ آپ کی عظیم شخصیت گوناگوں صفات کی حامل ہے ـــــ جناب عبدالباری قیوم (شاہد) نے آپ کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ اس بار محفل المنار میں ملک کے چوٹی کے شعراء جناب احسان دانش، جناب سجاد باقر رضوی اور جناب ثاقب زیروی شریک ہیں۔

جناب احسان دانش کی زندگی مصائب و مشکلات کی ایک طویل داستان ہے ـــــ آپ نے افلاس کی آغوش میں آنکھ کھولی ـــــ اسی کے زیر سایہ پل کر جواں ہوئے ـــــ ہم آپ کی جواں ہمتی اور استقلال کی داد دیئے بغیر

نہیں رہ سکتے کہ آپ نے اپنی زندگی میں پیش آمدہ مصائب و مشکلات کا مقابلہ بڑی ہمت اور جواں مردی سے کیا اور عزم و استقلال کا دامن اس وقت تک ہاتھ سے نہ چھوڑا جب تک آپ کو دنیائے شاعری میں ایک ممتاز حیثیت حاصل نہ ہو گئی ——— انسان کی زندگی خود تعمیر کردہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی شاعری انقلابی شاعری ہے ۔ وہ نادار مزدور کی پامالی زندگی کی اصلاح چاہتے ہیں ——— اس شمارہ میں آپ کی غزل ملاحظہ فرمائیے۔ سیدھے سادے مگر دلکش اور مانوس الفاظ آپ کے اشعار کی جان ہیں۔ جس سے زبان میں سلاست و صفائی پیدا ہو گئی ہے ———

جناب سجاد باقر رضوی ایک مرتبہ بزم اردو کے تحت ایک تقریب میں یہاں تشریف لائے تھے اور اپنے بلند پایہ کلام سے حاضرین کو مستفیض فرمایا تھا ——— اس تقریب میں آپ کی سنائی گئی غزل المنار کے صفحات کی زینت بنی ہے ——— ہم باقر صاحب کے شاگرد رشید جناب خالد آفاقی کے ممنونِ احسان ہیں کہ انہوں نے یہ غزل ہمیں مرحمت فرمائی ——— جناب شبیر شاہد کی نظم "معرضِ اظہار" دعوتِ عمل ہے ——— خالد آفاقی اور عاصم صحرائی ——— ہمارے کالج کے پرانے طلباء میں سے ہیں۔ گو کالج چھوڑ چکے ہیں لیکن المنار سے وابستگی بدستور قائم ہے۔

"پارہ ہائے جگر" ——— یہ کالم صرف ہمارے کالج کے شعراء کے لئے وقف ہے ——— یہ نوآموز شاعر ——— زبان دیکھئے، کلام دیکھئے ——— افسانہ "زود پشیماں" سال چہارم کے طالب علم اعجاز الحسن گیلانی کی تخلیق ہے۔ گو بات مختصر ہے ——— لیکن عجیب ٹریجڈی ہے ——— کاش! تصور کچھ کرنے سے پہلے سوچتا ——— استاذی المحترم پروفیسر محمد عثمان صدیقی کے تحریر کردہ عربی مضمون کے متعلق کچھ کہنا چھوٹا منہ بڑی بات ہے ——— ہمیں ان سے نسبت تلمذ بھی ہے۔ نسخ قرآن کو موضوع بحث بنایا ہے۔ خیال عالمانہ ہے ——— الانسان والکون ——— کے عنوان سے عربی مضمون سال سوم کے طالب علم ایوب اقبال احمد کا تحریر کردہ ہے۔ ع

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

معذرت

اس دفعہ پرچہ بہت تاخیر سے آپ کے ہاتھوں میں پہنچ رہا ہے۔ اس ضمن میں ادارہ آپ سے دلی طور پر معذرت خواہ ہے کہ آپ کو اتنا لمبا عرصہ انتظار کرنا پڑا۔ ع

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا

عبد الکریم خالد

تعلیم الاسلام کالج ربوہ کے تحت آل ربوہ ہاکی ٹورنامنٹ کا انعقاد

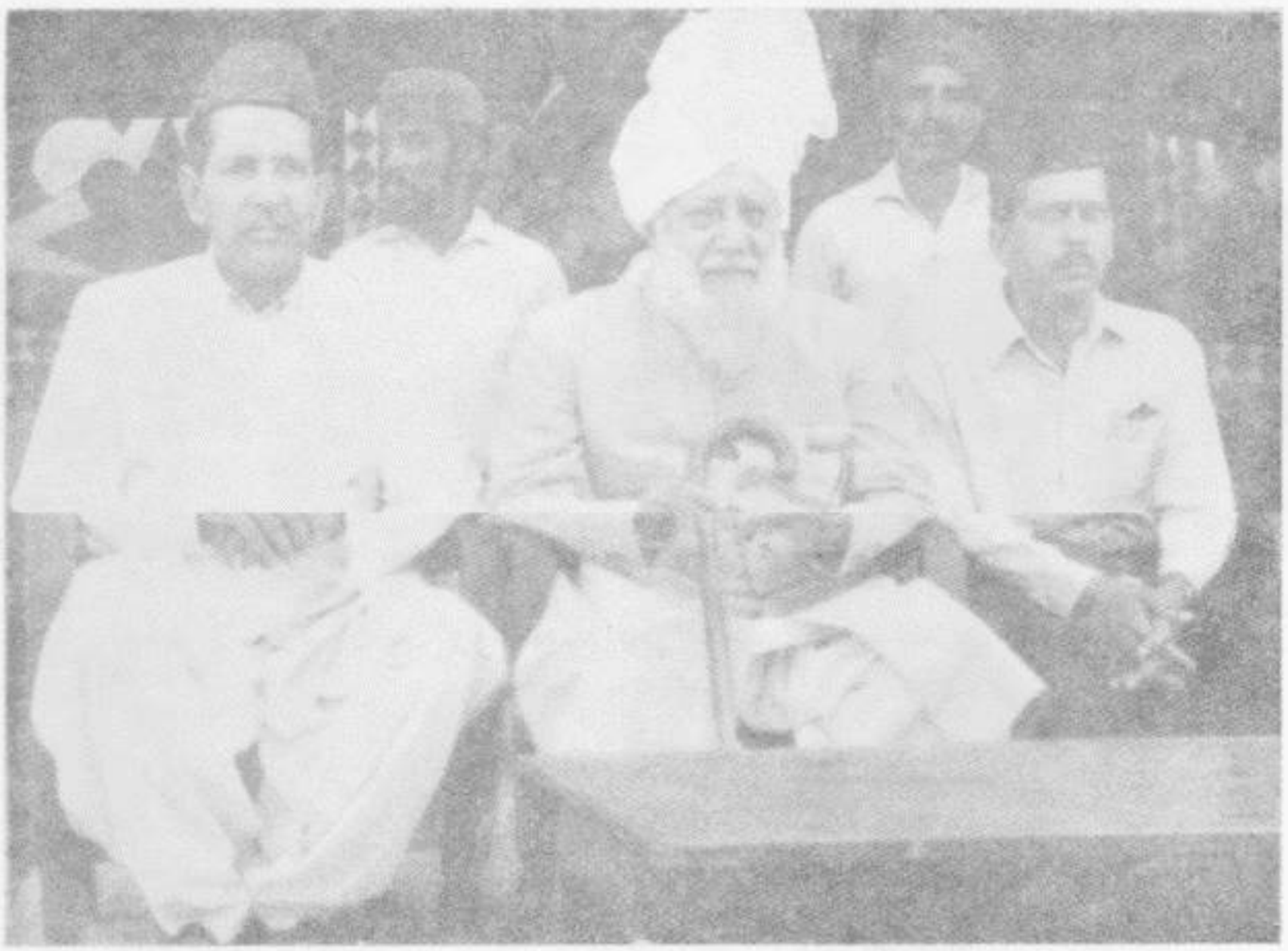

حضرت حافظ مرزا ناصر احمد صاحب (امام جماعت احمدیہ) ٹورنامنٹ کے آخری دن فائینل میچ دیکھ رہے ہیں آپ کے ہمراہ جناب چوہدری بشیر احمد صاحب مجلس صحت اور جناب پروفیسر عبدالرحمان ناظر تعلیم بھی موجود ہیں۔

حضور ایدہ اللہ تعالیٰ کو کھلاڑیوں سے متعارف کرایا جارہا ہے

تعلیم الاسلام کالج اور محلہ دارالرحمت کی ٹیمیں حضور ایدہ اللہ کے ہمراہ

تقسیم انعامات

حضور ایدہ اللہ تعالیٰ
ایک کھلاڑی پرویز احمد کو
انعام عطا فرما رہے ہیں

حضور ایدہ اللہ تعالیٰ تعلیم الاسلام کالج کی
ٹیم کے کیپٹن کو ٹرافی عطا فرما رہے ہیں

طلبہ کی ایک عظیم ذمہ داری

حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ۲ر اپریل ۱۹۵۰ء کو تعلیم الاسلام کالج لاہور کے کانووکیشن کے موقع پر ایک بصیرت افروز خطبہ ارشاد فرمایا تھا جس میں آپ نے اُس عظیم ذمہ داری کی طرف متوجہ کیا تھا جو وطنِ عزیز پاکستان کا شہری ہونے کی وجہ سے طلبہ پر عائد ہوتی ہے۔ موجودہ حالات کے پیشِ نظر آپ کے اُس خطاب کا ایک حصہ پیش کیا جا رہا ہے ——————(ادارہ)

"تم ایک نئے مُلک کے شہری ہو۔ دُنیا کی بڑی مملکتوں میں سے بظاہر ایک چھوٹی مملکت کے شہری ہو۔ تمہارا ملک مالدار مُلک نہیں ہے ایک غریب ملک ہے . . . .

. . . تمہیں اپنے ملک کی عزّت اور ساکھ دُنیا میں قائم کرنی ہوگی تمہیں اپنے وطن کو دنیا سے روشناس کرانا ہوگا۔ مُلکوں کی عزّت کو قائم رکھنا بھی ایک بڑا دشوار کام ہے اور یہی دشوار کام تمہارے ذمہ ڈالا گیا ہے۔ تم ایک نئے ملک کی نئی پود ہو۔ تمہاری ذمہ داریاں پُرانے ملکوں کی نئی نسلوں کی نسبت بہت زیادہ ہیں۔ اُنہیں ایک بنی بنائی چیز ملتی ہے۔ اُنہیں آباؤ اجداد کی روایتیں وراثت میں ملتی ہیں مگر تمہارا یہ حال نہیں ہے۔ تم نے ملک بھی بنانا ہے اور تم نے نئی روایتیں بھی قائم کرنی ہیں، ایسی روایتیں جن پر عزّت اور کامیابی کے ساتھ آنے والی بہت سی نسلیں کام کرتی چلی جائیں اور ان روایتوں کی راہنمائی میں اپنے مستقبل کو شاندار بناتی چلی جائیں۔ پس دوسرے قدیمی ملکوں کے لوگ ایک اولاد ہیں مگر تم اُن کے مقابلہ پر ایک باپ کی حیثیت رکھتے ہو۔ وہ اپنے باپ دادوں کو دیکھتے ہیں تم نے اپنے کاموں میں آئندہ آنے والی نسلوں کو مدِّنظر رکھنا ہوگا۔ جو بنیاد تم قائم کرو گے آئندہ آنیوالی نسلیں ایک حد تک اُس بنیاد پر عمارت قائم کرنے پر مجبور ہونگی۔ اگر تمہاری بنیاد ٹیڑھی ہوگی تو اس پر قائم کی گئی عمارت بھی ٹیڑھی ہوگی۔ اسلام کا مشہور فلسفی شاعر کہتا ہے ؎

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

یعنی اگر معمار پہلی اینٹ ٹیڑھی رکھتا ہے تو اُس پر کھڑی کی جانے والی عمارت اگر ثریا تک بھی جاتی ہے تو ٹیڑھی ہی جاتی ہے۔ پس بوجہ اِس کے کہ تم پاکستان کی خشتِ اوّل ہو تمہیں اِس بات کا بڑی احتیاط سے خیال رکھنا چاہیئے کہ تمہارے طریق اور عمل میں کوئی کجی نہ ہو۔ کیونکہ اگر تمہارے طریق اور عمل میں کوئی کجی ہو گی تو پاکستان کی عمارت ثریا تک ٹیڑھی چلی جائے گی۔

بے شک یہ کام مشکل ہے لیکن اتنا ہی شاندار بھی ہے۔ اگر تم اپنے نفسوں کو قربان کر کے پاکستان کی عمارت کو مضبوط بنیادوں پر قائم کر دو گے تو تمہارا نام اُس عزّت اور محبّت سے لیا جائے گا جس کی مثال آئندہ آنیوالے لوگوں میں نہیں پائی جائے گی۔

پس مَیں تم سے کہتا ہوں کہ اپنی نئی منزل پر عزم، استقلال اور علوِ حوصلہ سے قدم مارتے چلے جاؤ کہ عالی ہمت نوجوانوں کی منزلِ اوّل بھی ہوتی ہے، منزلِ دوم بھی ہوتی ہے، منزلِ سوم بھی ہوتی ہے لیکن آخری منزل کوئی نہیں ہُوا کرتی۔ ایک منزل کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری وہ اختیار کرتے چلے جاتے ہیں۔ وہ اپنے سفر کو ختم کرنا نہیں جانتے، وہ اپنے رختِ سفر کو کندھے سے اُتارنے میں اپنی ہتک محسوس کرتے ہیں۔ اُن کی منزل کا پہلا دَور اُس وقت ختم ہوتا ہے جبکہ وہ کامیاب و کامران ہو کر اپنے پیدا کرنے والے کے سامنے حاضر ہوتے ہیں اور وہی اُن کی خدمت کا صحیح بدلہ دے سکتا ہے۔ پس اے خدائے واحد کے منتخب کردہ نوجوانو! اسلام کے بہادر سپاہیو! ملک کی امیدوں کے مرکزو! قوم کے سپُوتو! آگے بڑھو کہ تمہارا خدا، تمہارا دین، تمہارا ملک اور تمہاری قوم محبّت اور اُمید کے مخلوط جذبات سے تمہارے مستقبل کو دیکھ رہی ہے ــــ!"

○

مسلمانوں کی فتوحات

(جنگِ بدر سے قیامِ پاکستان تک کا تاریخی پس منظر)

مسلمان ایک صحیح اور صحت مند علمی، ادبی اور عسکری روایات کے مالک تھے۔ خلوص، محبت اور رواداری ان کا شیوہ تھی۔ لڑائیوں اور جنگوں میں وہ خصوصیت سے اس چیز کے پابند تھے کہ انصاف، حقیقت روی اور صداقت سے پہلو تہی نہ کریں ——— لیکن جب اس برصغیر پر انگریزوں نے غاصبانہ قبضہ کر کے ملک ہند اور ساری قوم کو غلام بنا یا تو انہوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ مسلمانوں کا علمی اور تاریخی سرمایہ غارت کر ڈالا ——— ہمارے اسلاف کے کارہائے نمایاں کو اس طرح مسخ کر ڈالا کہ ہماری نئی پود اپنے آباؤ اجداد کے عظیم کارناموں کو یکسر فراموش کر کے اہلِ فرنگ کی ہمنوا بن گئی۔ انگریزوں نے یہ ستم کیا کہ رفتہ رفتہ مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کے تابندہ نشانات بھی مٹا ڈالے تاکہ ہم اپنی روایات سے بے خبر ہو جائیں۔ ذیل کا جائزہ "ماہِ نو" کی مدد سے تیار کیا گیا ہے اور یہ جائزہ اس لحاظ سے نہایت اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں تاریخ کے آئینے میں مسلمانوں کے عظیم کارناموں اور شاندار فتوحات کو پیش کیا گیا ہے۔

ہم اپنے اسلاف کی عظیم روایات پر جتنا بھی فخر کریں کم ہے ——— (ع۔ ک۔ خ)

سنہ ۲ھ:۔ جنگ بدر۔ ۳۱۳ مسلمانوں نے ایک ہزار کفار کو شکست دی۔ یہ کفر و اسلام کا پہلا معرکہ تھا۔

سنہ ۸ھ:۔ مسلمانوں نے مکہ فتح کیا۔ اسی سال طائف بھی فتح ہوا۔

سنہ ۹ھ:۔ غزوہ تبوک۔ ۳۰ ہزار مسلمانوں نے ایک لاکھ رومیوں کو شکست فاش دی۔

سنہ ۱۱ھ:۔ یمن، حجاز اور نجد مسلمانوں کے قبضہ میں آئے۔

۱۱تا۱۳ھ: فتح عراق (بعہدِ خلافت حضرت ابوبکر صدیقؓ) دین کی خاطر ملکِ شام پر مسلمانوں کی یلغار شروع ہوئی۔

۱۳تا۲۳ھ:۔ دورِ خلافت حضرت عمرؓ۔ شاندار فتوحات کا دور۔ شام، مصر، آذربائیجان اور ایشیائے کوچک کے کچھ علاقے مسلمانوں کے زیرِ نگیں آئے۔

بعلبک، شہزاد اور حمص کے مشہور معرکوں میں مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی۔ حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں تقریباً ۹۶ ہزار چھوٹے بڑے شہر اور قلعے فتح ہوئے۔

۲۳ تا ۳۵ھ :- دورِ خلافت حضرت عثمان غنیؓ۔ فتح افریقہ، بحرِ روم، جزائر روڈس، قبرص اور ایران کے غیر مفتوحہ علاقے اسلامی پرچم تلے آ گئے۔

۳۵ تا ۴۰ھ :- دورِ خلافت حضرت علی کرم اللہ وجہہ۔ جنگیں اور بغاوتیں زیادہ رہیں۔ ان فتنوں کو دبانے میں بڑا وقت صرف ہوا مگر پھر بھی اسلام کا اثر دور دور تک پہنچا اور تمام اقوامِ عالم پر مسلمانوں کی دھاک بیٹھ گئی۔

۴۸ھ :- امیر معاویہؓ کے دور میں روم کے اکثر شہر فتح ہوئے قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا گیا

۵۰ھ :- شمالی افریقہ کے دور افتادہ مقامات، مارٹینیا اور صحرائے اعظم مسلمانوں نے فتح کئے اور طنجہ کا حکمران مطیع و اسیر ہوا۔

۶۱ھ :- حضرت مسلم بن زیادہ نے خوارزم و بخارا فتح کئے۔

۶۳ھ :- حضرت عقبہ بن نافع نے مغرب اقصیٰ فتح کیا۔

۸۴ھ :- خلیفہ ولید بن عبدالملک کے دور میں ایک بار پھر بازنطینیوں اور رومیوں کے علاقے مسلمانوں نے فتح کئے اور ایشیائے کوچک پر پوری طرح چھا گئے۔

۸۶ھ :- ولید بن عبدالملک نے اپنے بھتیجے قتیبہ بن مسلم کو خراسان کا گورنر بنا کر بھیجا۔ اس نے ایران کی سرحد پار کر کے روسی ترکستان اور مازندران پر اسلامی پرچم لہرا دیا۔

۹۰ھ :- تاتار اور ماوراء النہر فتح ہوئے اور آس پاس کا بہت سا علاقہ مسلمانوں کے زیرِ نگین آیا

۹۲ھ :- اسپین، پرتگال اور جنوبی فرانس مسلمانوں نے فتح کر لئے۔

۹۳ھ :- محمد بن قاسم نے ہندوستان پر سندھ کی جانب سے حملہ کیا اور سندھ و ملتان فتح ہو گئے۔

۹۵ھ :- جزیرہ سارڈینیا میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی۔

۹۷ھ :- یزید بن مہلب نے جرجان اور طبرستان کو سخت جنگوں کے بعد دائرۂ فتوحاتِ اسلام میں شامل کر لیا۔

۱۰۴ھ :- جراح بن عبداللہ کی قیادت میں آرمینیا فتح ہوا۔ اسی سال سمح بن مالک نے فرانس کے شہر طولون کا محاصرہ کیا۔

۱۱۴ھ :- عبدالرحمٰن بن عبداللہ کی سپہ سالاری میں فرانس پر حملہ ــــ فرانس کے دو صوبوں، بورگینیا اور ایکیٹینیا کو روند ڈالا گیا۔

چارلس مارٹل کی فوج کو شکست دی اور ــــ بورڈیو تک کا یہ علاقہ بھی مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔

۱۱۷ھ :- حبیب ابی عبیدہ نے سوڈان تک اسلامی پرچم لہرا دیا۔

۱۱۹ھ :- فرغانہ اور خوقند میں کفار کو شکست اور سب علاقوں پر مسلمانوں کا قبضہ۔

سنہ ۱۲۱ھ :- رومی ملکوں پر مسلمہ بن عبدالمالک کا حملہ۔ کافروں کے سب قلعے فتح ہوگئے اور مروان بن محمد گورنر آرمینیا نے کاکیشیا (یعنی کوہ قاف) کے علاقے فتح کئے اور وہاں کے حاکم نے جزیہ دینا منظور کیا۔

سنہ ۱۲۲ھ :- جزیرہ صقلیہ (سسلی) پر قبضہ۔

سنہ ۱۶۵ھ :- خلیفہ مہدی کے صاحبزادے شاہزادہ ہارون رشید نے رومیوں پر حملہ کیا اور قسطنطنیہ پہنچ کر ملکہ آگسٹس کو خراج دینے پر مجبور کیا۔

سنہ ۲۲۴ھ :- مسلمانوں نے مشرقی افریقہ کی طرف رُخ کیا اور ایتھیوپیا و سومالی لینڈ سے نکل کر جنوبی افریقہ اور زنجبار تک فتح کر لیا۔

سنہ ۲۲۶ھ :- بحر اوقیانوس کے پچاس سے زیادہ جزیروں پر مسلمانوں کا قبضہ۔

سنہ ۲۲۰ تا ۲۲۵ھ :- یعقوب بن لیث اور دوسرے عرب مسلمانوں نے افغانستان اور روسی ترکستان تک اسلام کا ڈنکا بجا دیا اور لوگ اپنی خوشی سے مسلمان ہونا شروع ہوئے۔

سنہ ۳۷۴ھ :- راجہ جے پال نے غزنی پر حملہ کر کے اُسے تباہ کرنا چاہا لیکن سلطان سبکتگین نے اُسے شکست دی۔ اس طرح کچھ علاقے مسلمانوں کے قبضہ میں آ گئے۔

سنہ ۳۷۶ھ :- راجہ جے پال نے عہد شکنی کی اور پھر حملہ کیا۔ اِس مرتبہ دریائے سندھ کے مغربی کناروں تک مسلمانوں نے قبضہ کر لیا۔

سنہ ۳۸۱ھ :- راجہ جے پال نے سلطان سبکتگین کے انتقال کے بعد اُن کے بیٹے شاہ محمود غزنوی کی تخت نشینی کے بعد تیسری مرتبہ پھر حملہ کیا مگر اِس دفعہ اُسے پچھلی دونوں شکستوں سے بھی زیادہ شکست اُٹھانی پڑی۔ مسلمانوں نے جہلم تک کا علاقہ فتح کر کے اسلامی پرچم لہرا دیا اور فوجوں کا تعاقب کر کے راجہ جے پال کو مع فوج گرفتار کر لیا۔

سنہ ۳۹۵ھ :- سلطان محمود غزنوی نے قرامطیوں کے باعث اور راجہ آنند پال کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے بھاٹیہ پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا۔

سنہ ۴۰۶ھ :- محمود غزنوی نے تھانیسر اور نارائن کو فتح کر کے اُن پر اسلامی پرچم لہرا دیا۔

سنہ ۴۰۹ھ :- کشمیر فتح ہوا اور راجہ کو مطیع بنا لیا گیا۔

سنہ ۴۱۳ھ :- سومنات پر حملہ ہوا اور شمالی ہند کے علاقے فتح کر لئے گئے۔

سنہ ۵۸۸ھ :- گوالیار، آگرہ، قنوج اور بنارس فتح ہوئے اور اسی سال گجرات، میرٹھ اور علی گڑھ مسلمانوں کے قبضہ میں آ گئے۔

سنہ ۵۶۰ھ :- بہار اور بنگال کی فتح مسلمانوں کو نصیب ہوئی۔
سنہ ۶۲۶ھ :- شمس الدین التمش نے اڑیسہ کو اسلامی سلطنت کا جزو بنالیا۔
سنہ ۶۹۱ھ :- علاؤالدین خلجی کی سرکردگی میں فتح دکن کی مبارک ساعت آئی۔
سنہ ۷۰۹ھ :- خواجہ حاجی نے تلنگانہ، کرناٹک اور مالابار فتح کئے۔
سنہ ۷۲۷ھ :- سلطان ارخان نے ساحل باسفورس تک ایشیائے کوچک کو فتح کیا۔
سنہ ۷۶۱ھ :- شاہ مراد خان اوّل نے ایڈریانوپل فتح کیا۔
سنہ ۷۶۵ھ :- شاہ مراد خان اوّل نے رومانیہ اور تولیس پر قبضہ کرلیا۔ یہ عیسائیوں کے حملے کا جواب تھا۔
سنہ ۷۸۸ھ :- روس، پولینڈ، یونان، ہنگری، آسٹریا، سربیہ اور بلغاریہ کی سلطنتوں نے متحد ہوکر مسلمانوں پر حملہ کردیا۔ لیکن انہیں شکست فاش ہوئی اور سربیہ، یونان اور بلغاریہ نے خراج دینا منظور کیا۔
سنہ ۷۹۱ھ :- سلطان بایزید یلدرم نے دریائے ڈینیوب تک مشرقی یورپ کا علاقہ فتح کرلیا۔
سنہ ۷۹۹ھ :- انگلینڈ، جرمنی، اٹلی، فرانس، پولینڈ، بوسینا، آسٹریا اور ہنگری نے متحد ہوکر ترکوں پر حملہ کیا۔ ان متحد ممالک کی فوج چھ لاکھ تھی اور ترک فوج کی تعداد صرف بیالیس ہزار نکوپولس کے مقام پر فیصلہ کن جنگ ہوئی۔ ترکوں نے عیسائیوں کو مار بھگایا اور پولینڈ، انگلینڈ، فرانس، اٹلی، جرمنی اور بوسینا کے شاہزادوں کو قید کرلیا۔
سنہ ۸۰۴ھ :- شاہ بایزید یلدرم نے یونان فتح کرکے آسٹریا اور ہنگری کے کچھ علاقوں پر قبضہ کرلیا۔
سنہ ۸۲۴ھ : سربیہ فتح ہوا۔
سنہ ۸۵۷ھ :- محمد خان ثانی نے قسطنطنیہ پر اسلامی پرچم لہرایا۔
سنہ ۸۶۰ھ :- یوگوسلاویہ، ہنگری، رومانیہ، بلغاریہ فتح کئے گئے۔
سنہ ۸۶۵ھ :- شاہ محمد خان ثانی نے اٹلی کا شہر اوٹرنٹو اور بحر یونان کے جزائر رہوڈس فتح کئے۔
سنہ ۹۰۶ھ :- ترکوں نے بحر روم میں اٹلی، وینس، اسپین اور فرانس کے متحدہ بحری بیڑوں کو شکست فاش دی۔
سنہ ۹۲۰ھ :- سلطان سلیم خان اوّل نے جارجیا، آرمینیا اور کوہ قاف کے علاقے فتح کرکے اپنی حکومت میں شامل کرلئے۔
سنہ ۹۳۳ھ :- سلطان ظہیرالدین محمد بابر دہلی پہنچا۔
سنہ ۹۶۲ھ :- نصیرالدین محمد ہمایوں نے دہلی کو دوبارہ فتح کیا۔
(ہمایوں نے سنہ ۹۳۷ھ سے سنہ ۹۴۷ھ تک حکومت کی۔ پھر سنہ ۹۶۲ھ سے سنہ ۹۶۳ھ تک دوبارہ تخت سنبھالا)
سنہ ۹۶۳ھ تا سنہ ۱۰۱۴ھ :- جلال الدین اکبر نے ہندوستان پر حکومت کی۔

۱۰۱۴ھ :۔ سلطان جلال الدین محمد اکبر نے جنوبی ہندوستان پھر فتح کر لیا۔

۱۰۱۴ھ تا ۱۰۳۷ھ :۔ نور الدین محمد جہانگیر کی حکومت رہی اور جنوب مشرقی ہندوستان، کابل اور قندھار تک کو فتح کر لیا۔

۱۰۳۷ھ تا ۱۰۶۸ھ :۔ سلطان شہاب الدین محمد شاہجہان کی حکومت کا زمانہ ہے۔ جو شاندار عمارات کیلئے مشہور ہے۔

۱۰۶۸ھ تا ۱۱۱۷ھ :۔ سلطان محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر نے حکومت کی اور ۱۰۸۰ھ میں چاٹگام، آسام اور ارکان فتح کئے۔

۱۱۱۷ھ تا ۱۱۲۳ھ :۔ سلطان بہادر شاہ اول کی حکومت رہی۔

۱۱۲۳ھ تا ۱۱۶۷ھ :۔ سلطان احمد شاہ تخت پر متمکن رہے۔

۱۱۶۷ھ تا ۱۲۲۱ھ :۔ پہلے عالمگیر ثانی اور اس کے بعد ان کے لڑکے شاہ عالم نے حکومت کی۔

۱۲۲۱ھ تا ۱۲۵۳ھ :۔ معین الدین اکبر ثانی کا زمانہ رہا۔

۱۲۵۳ھ تا ۱۲۷۳ھ :۔ ابو ظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر کی حکومت رہی۔ اس کے بعد سلطنت مغلیہ کا چراغ ہندوستان میں گُل ہو گیا۔

۱۹۴۷ء :۔ برصغیر کے مسلمانوں نے پھر ایک علیحدہ مملکت بنائی جو پاکستان کے نام سے دائم و قائم ہے۔

قائدِ اعظم کا ارشاد

"میرے نوجوان دوستو! میں تمہاری طرف اس توقع سے دیکھتا ہوں کہ تم پاکستان کے حقیقی معمار ہو۔ دوسروں کا آلۂ کار مت بنو اور ان کے بہکانے میں مت آؤ۔ اپنے اندر مکمل اتحاد اور جمعیت پیدا کرو۔ اس کی مثال قائم کر دو کہ نوجوان کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ اگر تم اب اپنی قوتوں کو فضول کاموں میں ضائع کرو گے تو بعد میں افسوس کرو گے۔ جب تم یونیورسٹیوں اور کالجوں سے فارغ التحصیل ہو جاؤ تو پھر آزادی سے سرگرم ہو کر اپنی اور مملکت دونوں کی مدد کر سکتے ہو۔"

جلسہ علم میں تقریر
ڈھاکہ۔ ۲۱ر مارچ ۱۹۴۸ء

عبدالباری قیوم

پروفیسر قاضی محمّد اسلم ایم۔اے کینٹب

کم و بیش نصف صدی تک درس و تدریس اور علم و ادب کے میدان میں قابلِ قدر اور انتھک خدمات سرانجام دینے کے بعد جامعہ پنجاب اور جامعہ کراچی کے قابل و لائق اُستاد گورنمنٹ کالج لاہور اور تعلیم الاسلام کالج ربوہ کے مقبول و مشہور اور ہردلعزیز پرنسپل جناب پروفیسر قاضی محمد اسلم ایم۔اے (کینٹب) ـــــ لاہور کی کشادہ و صاف ستھری آبادی گلبرگ میں سادہ مگر باوقار کوٹھی میں اب بھی گھریلو محاذ پر علمی، دینی، ادبی، گھریلو اور جماعتی سرگرمیوں میں مشغول ہیں ـــــ اپنی اُفتادِ طبع کی بناء پر کہ جیسے وہ فارغ اور بیکار رہنا جانتے ہی نہیں۔ پیرانہ سالی اور ماضی قریب میں ایک طول طویل جسمانی تکلیف میں مبتلا رہنے کے باوجود وہ بھلے چنگے خوش باش اور صحت مند دکھائی دیتے ہیں۔ وہ جب گرمجوشی سے مصافحہ کرتے ہیں تو اُن کے وجود میں ایک باصحت تنومند جوان کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اور چہرے پر پھیلی مسکراہٹ ہلکی سی سلوٹوں کے جلو میں کسی گہری سوچ، تدبّر اور فکر کا پتہ دیتی ہے۔ اور پھر فاضلانہ فلسفیانہ ـــــ دُوراندیشانہ طرزِ گفتگو ـــــ گھنٹوں بیٹھے رہیے اُٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔

جناب قاضی صاحب جماعت احمدیہ کے مشہور خاندان کے چشم و چراغ ہیں جو "قاضی فیملی" کے نام سے مشہور ہے۔ اس خاندان کی کئی پُشتوں نے حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ کا زمانہ پایا اور گرانقدر خدمات سرانجام دیں۔ آپ کے جلیل القدر والد حضرت ڈاکٹر قاضی کرم الٰہی صاحبؓ اور دادا حضرت مولوی غلام رسول صاحب، اور خاندان کے کئی افراد کو حضورؑ کے اصحاب میں شمولیت کا اعزاز حاصل ہوا اور سبھی نے اپنی استعداد اور ہمت کے مطابق بڑے اخلاص اور فدائیت کے جذبہ سے احمدیت کی خدمت کی۔

محترم قاضی صاحب کے والد محترم حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہؑ کے زمانہ سے لے کر عرصہ دراز تک صدر انجمن احمدیہ کی مجلس معتمدین کے ممبر رہے۔ اسی طرح انہیں حضورؑ اور آپ کے خلفاءؓ کا معالج ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔ وہ عرصہ تک صدر انجمن احمدیہ کے طبی مشیر رہے۔ جماعت احمدیہ امرتسر کے پہلے امیر ہونے کی حیثیت سے انہوں نے قابلِ قدر خدمات سرانجام دیں اور اِس عہدہ پر وہ اپنی وفات تک متمکن رہے۔

غرضیکہ آپ کا خاندان سلسلہ کے اوّلین فدائی خاندانوں میں سے ایک ہے۔ یہ آپ کے والدین کا حُسنِ تربیت ہے کہ اُنہوں نے اپنے امرتسر والے مکان کو دینی تربیت گاہ بنایا ہوا تھا۔ اور ایک عظیم دینی و رُوحانی اور علمی ماحول پیدا کر رکھا تھا۔ چنانچہ بعد میں اور اب بھی اِس گھریلو درسگاہ کے تربیت یافتہ افراد بڑے بڑے ڈاکٹروں، وکیلوں، انجینئروں اور اساتذہ میں شامل اور حکومت کے اعلیٰ عُہدوں پر فائز نظر آتے ہیں۔ جناب قاضی صاحب کو بھی اِس گھریلو درسگاہ کا تربیت یافتہ ہونے پر فخر ہے اور وہ اِس ماحول کا بڑی خوشی اور سرور سے ذکر فرمایا کرتے ہیں۔

حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد المصلح الموعودؓ نے ایک دوست کے نام ایک خط میں جناب قاضی صاحب کے ضمن میں ایک مرتبہ جواباً تحریر فرمایا کہ:۔

"وہ ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جس کے جماعت احمدیہ پر اِس قدر احسانات ہیں کہ جماعت اس کا حق ادا نہیں کر سکتی۔"

"قاضی فیملی" میں ایک تقریبِ رخصتانہ کے موقعہ پر حضرت امام جماعت احمدیہ ایدہ اللہ نے ارشاد فرمایا کہ:۔

"یہ خاندان حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہؑ کے زمانہ میں احمدیت کی بڑی خدمت کر چکا ہے۔ اِس خاندان کے افراد کو یہ توفیق ملی کہ اُنہوں نے راضی خوشی اپنی زندگی دین کی خدمت میں لگا دی۔ اِس خاندان کے افراد کو نمایاں طور پر خدمتِ دین کا موقعہ ملا ہے۔ انہوں نے بغیر کسی قسم کی جھجھک اور ہچکچاہٹ کے اپنی زندگیوں کو دین کی خدمت میں لگا دیا اور اِس بات کی پرواہ نہ کی کہ دنیوی طور پر اُنہیں کیا ملے گا۔ اللہ تعالیٰ نے بھی اُن کے ساتھ یہ سلوک کیا کہ اُنہیں دین میں بھی عزت دی اور دنیوی طور پر بھی اپنی نعمتوں سے نوازا۔ جس میں بعد میں آنے والے نوجوانوں کے لئے سبق ہے کہ جو لوگ یا جو خاندان اپنے آپ کو دین کی خدمت میں لگا دیتے ہیں اُنہیں اللہ تعالیٰ کس طرح نوازتا ہے اور کس حد تک اُنہیں دینی طور پر ترقی دیتا ہے اور دُنیا میں بھی اُن کی عزت کو قائم کرتا ہے۔ اِس خاندان کے بزرگوں کی اُن خدمات کا جو اُنہوں نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے وقت میں کی تھیں یہ نتیجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اِس خاندان کو عزت و عظمت عطا فرمائی ہے۔ اِس خاندان کے بعض افراد میرے استاد بھی ہیں۔ سکول کے زمانہ میں

بھی ایک استاد رہے ہیں اور کالج کے زمانہ میں بھی میرے ایک استاد قاضی فیملی میں سے تھے گویا اللہ تعالیٰ نے اِس خاندان کو یہ نعمت عطا فرمائی ہے کہ اُن کے بزرگ حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کے وقت میں سلسلہ کی خاص خدمات بجا لاتے رہے۔۔۔۔۔"

(الفضل ۲۵ر نومبر ۱۹۶۵ء صـ۶)

حضرت قاضی صاحب ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم امرتسر میں پائی۔ وہیں ایم۔ اے۔ او ہائی سکول امرتسر سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ بعدازاں علیگڑھ مسلم کالج سے اعلیٰ تعلیم کا آغاز کیا۔

۱۹۲۱ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے فلسفہ میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج کیمبلپور سے بحیثیت لیکچرر ملازمت کا آغاز کیا۔ ازاں بعد گورنمنٹ کالج لاہور منتقل ہو گئے جہاں سے تھوڑا عرصہ بعد آپ مزید اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے انگلستان تشریف لے گئے اور کیمبرج یونیورسٹی سے فلسفہ و نفسیات کے مضمون میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد وطن واپس لوٹے اور گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر کی حیثیت سے باقاعدہ علمی خدمات کا آغاز کیا۔

دورانِ قیام انگلستان آپ نے احمدیہ مشن کے لئے گرانقدر خدمات سرانجام دیں اور حضرت المصلح الموعودؓ کی بعض تصانیف کا انگریزی ترجمہ کیا جسے عوام و خواص ہر دو نے پسند کیا اور قدر کی نگاہ سے دیکھا۔

وطن واپس تشریف لانے کے بعد آپ ۱۹۵۴ء تک گورنمنٹ کالج لاہور میں تعلیم و تدریس کے فرائض سرانجام دیتے رہے اور سالہا سال اس ادارہ کے پرنسپل کی حیثیت سے گرانمایہ خدمات سرانجام دیں۔

۱۹۵۴ء میں آپ جامعہ کراچی کے شعبۂ فلسفیات و نفسیات کے صدر مقرر ہو کر لاہور سے کراچی تشریف لے گئے اور ۱۹۶۶ء تک اس عظیم ذمہ داری کو بکمال احسن بجا لاتے رہے۔

فروری ۱۹۶۶ء میں حضرت امام جماعت احمدیہ نے آپ کو تعلیم الاسلام کالج ربوہ کا پرنسپل مقرر فرمایا۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۷۰ء تک آپ نے اس عظیم درسگاہ کو اپنے تبحرِ علمی سے سیراب کیا اور اپنے عظیم علمی اور روحانی وجود سے یہاں کے طلبہ کو مستفید کیا۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو علمی، سائنسی، روحانی، دینی حقائق کو دلکش طرزِ بیان اور عمدہ اسلوبِ تحریر میں ایک مخصوص فلسفیانہ انداز میں بیان کرنے کی قدرت عطا کی۔ چنانچہ آپ کے اِسی وصف کی بناء پر حضرت المصلح الموعودؓ نے آپ کو جماعتِ احمدیہ کے عالمگیر جلسہ سالانہ کا لیکچرار مقرر فرمایا اور آپ سالہا سال تک اپنے مفوّضہ مشکل مضامین کو سادہ و سہل اور دلکش ہلکے پھلکے پیرایہ میں سامعین کے ذہن نشین کرواتے رہے۔ آپ کی ہر تقریر سے بڑے بڑے علماء بھی اپنے علم میں ایک مفید اضافہ محسوس کرتے اور کم علم احباب بھی آپ کی تقریر کو بآسانی سمجھ لیتے۔

محترم قاضی صاحب موصوف کو ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۴ء تک امیرِ جماعت اور اس کے بعد سالہا سال تک نائب امیر جماعتِ احمدیہ لاہور کی حیثیت سے سلسلہ کی گراں بہا اور جلیل القدر خدمات کا بھی موقعہ ملا۔ آپ کے عہدِ امارت میں جماعتِ لاہور نے تنظیمی لحاظ سے بہت ترقی کی۔

۱۹۴۴ء میں تعلیم الاسلام کالج قادیان کی از سرِ نو تشکیل کے موقعہ پر حضرت المصلح الموعودؓ نے قیامِ کالج کے منصوبہ کو جلد سے جلد پایۂ تکمیل تک پہنچانے اور اُسے جاری کرنے کے انتظامات کی انجام دہی کے لئے ایک "کالج کمیٹی" مقرر فرمائی جس کے پانچ ممبران میں جناب قاضی صاحب بھی شامل تھے۔ اس کمیٹی نے نہایت مفید اور قابلِ قدر انتظامی خدمات سرانجام دیں جسے اکتوبر ۱۹۴۵ء میں مجلس تعلیم میں مدغم کر دیا گیا۔

تعلیم و تدریس کے اس طویل عرصہ میں آپ کی توجہات فلسفہ اور نفسیات کے مضامین کو ترقی دینے کے لئے وقف رہیں۔ آپ ۱۹۳۹ء میں گورنمنٹ کالج کے شعبۂ فلسفہ و نفسیات کے صدر مقرر ہوئے۔ جہاں تک کالج اور یونیورسٹی کو فلسفے کے میدان میں اعلیٰ بنیادوں پر قائم کرنے اور اُسے ترقی دینے کا تعلق ہے محترم قاضی صاحب کا اس میں بہت بڑا دخل ہے۔

شعبۂ نفسیات کی وسعت اور اُس کی اُس وقت کی ترقی پذیر حالت جس پر ایک لاکھ سے زائد روپیہ صرف ہوا تھا تمام تر آپ ہی کی مساعیٔ جمیلہ کی رہینِ منت ہے۔ پروفیسر قاضی محمد اسلم صاحب کا پنجاب یونیورسٹی کے سینئر ترین پروفیسروں اور ماہرینِ تعلیم میں شمار تھا۔ اِس عرصہ میں آپ ڈائرکٹر محکمۂ تعلیم پنجاب اور سیکرٹری حکومتِ پنجاب کے عہدوں پر بھی فائز رہے۔ پھر مُلک کے تعلیمی مسائل پر غور کرنے کے لئے مرکز نے جو تعلیمی کانفرنس طلب کی تھی آپ نے اس میں پنجاب کے ماہرینِ تعلیم کے وفد کی قیادت کی۔ آپ کے زمانۂ تعلیم و تدریس میں جن طلباء نے فارغ التحصیل ہو کر زندگی میں قدم رکھا ہے اُن میں سے اکثر کو قومی یونیورسٹیوں، افواج کے انتخابی بورڈ اور پبلک سروس کمیشن وغیرہ میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

آپ کے وفاقی دارالحکومت کراچی تشریف لے جانے سے آپ کی کمی کو نہ صرف ڈائرکٹر محکمۂ تعلیم پروفیسر سراج الدین نے محسوس کیا بلکہ پنجاب یونیورسٹی اور ریڈیو پاکستان نے بھی آپ کے یہاں سے تشریف لے جانے کو محسوس کیا۔ کیونکہ ہر دو اداروں میں بصیرت افروز تقاریر اور مکالموں سے آپ کو بے حد مقبولیت حاصل تھی۔

اِس موقعہ پر ڈائریکٹر تعلیم پروفیسر سراجدین نے محترم قاضی صاحب کو شاندار الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ :-

"پروفیسر قاضی محمد اسلم نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں اور خداداد فراست کی مدد سے فلسفہ اور نفسیات کے خشک مضامین کو مقبول اور ہر دلعزیز بنانے میں بہت اہم کردار

ادا کیا ہے۔"

۱۹۶۶ء سے ۱۹۷۰ء کے ربوہ کے قیام کے زمانہ میں محترم قاضی صاحب کو صدر انجمن احمدیہ پاکستان ربوہ میں ناظر تعلیم کے منصب جلیلہ پر فائز رہ کر ان قدر اور گراں مایہ خدمات سرانجام دینے اور تعلیمی معیار بلند کرنے کا بھی موقعہ ملا۔

قاضی صاحب موصوف مزاج شناس استاد، فن کے ماہر، اچھے منتظم اور شفیق و مہربان مربی کی حیثیت سے علم و ادب کی خدمت بجا لاتے رہے۔ طلباء کے ساتھ آپ کا سلوک ہمیشہ شفیقانہ، پدرانہ ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ تمام طلباء آپ سے بے حد محبت رکھتے تھے۔ ہر ایک سے ہر حالت میں خندہ پیشانی سے مسکراتے ہوئے ملتے اور اُن کے مسائل اور فلاح و بہبود کیلئے کوشاں رہتے۔ مجھے اُن کی ایک تجویز میں اپنے طلباء کے لئے خیر خواہی کے جذبات کا سیلاب امنڈتا نظر آیا جب انہوں نے ربوہ سے واپس لاہور تشریف لے جانے کے بعد ایک ملاقات میں فرمایا کہ "میرا دل چاہتا ہے کہ تعلیم الاسلام کالج ربوہ کا ایک ذیلی دفتر لاہور میں ہو جو طلباء کے لئے تازہ ترین ضروری معلومات کالج کو بھیجتا رہے تاکہ طلباء کو اپنے امتحانات پاس کرنے کے بعد اپنا آئندہ لائحہ عمل تیار کرنے میں کسی قسم کی دقت اور پریشانی نہ اُٹھانا پڑے۔"

حضرت قاضی صاحب کا مطالعہ بے حد وسیع ہے۔ وہ ہر قسم کے علوم پر دسترس رکھتے ہیں سلسلہ کے لٹریچر خصوصاً حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کی کتب پر انہیں عبور حاصل ہے اور کئی کتابوں کے حوالے انہیں ازبر ہیں۔ اپنے خصوصی مضمون پر پوری طرح حاوی بلکہ اس کے کئی نئے زاویوں کے موجد ہیں اور عقل و نقل کے ساتھ فلسفہ و نفسیات کو روحانی و دینی علوم کا عملی طور پر خادم ثابت کر دکھانا محترم قاضی صاحب موصوف کا عظیم کارنامہ ہے۔

محترم قاضی صاحب کی تقاریر و تحریرات بلاشبہ علوم کا بحر ذخار اور ایک انمول خزانہ ہیں جو اعلیٰ درجہ کے فلسفیانہ نوادرات سے پُر اور علم و فن، عقل و بصیرت کا بے نظیر اور اچھوتا شاہکار ہیں جن کا یکجا کیا جانا صاحبانِ ذوق کیلئے یقیناً مفید ہو سکتا ہے۔

محترم قاضی صاحب سے میرا ذاتی تعلق گزشتہ قریباً تین سال سے ہے جس کا باعث اُن کے والد محترمؒ اور خاندان کے بڑے بزرگوں کے سوانح حیات کی تدوین کا کام ہے جو تا حال جاری ہے۔ جب میں پہلی مرتبہ انہیں اس کام کے آغاز پر لاہور جا کر ملا تو پہلی ملاقات میں ہی مجھے یہ احساس ہوا کہ گویا میرا بچپن سے اُن کے ساتھ تعلق ہے۔ اپنائیت کا یہ احساس اُن سے ملنے والا ہر شخص اپنے دل میں لیکر لوٹتا ہے۔ پیرانہ سالی میں اپنے آباؤ اجداد و اقارب کے سوانح قلمبند کروانے کا اہتمام کروانا یقیناً اپنے محسن و مہربان والدین کی تربیت و احسانات کا کم از کم ـــــ مگر بہترین بدل ہے جسے قاضی صاحب نے منتخب فرمایا ہے۔ اب یہ کام تکمیل کے آخری مراحل طے کر رہا ہے۔ اُن کے بزرگ اور جلیل القدر والدین اور بڑے بھائیوں کے قابلِ رشک سوانح پر مشتمل کتاب "کرم الٰہی" جلد آپ کے ہاتھوں میں ہوگی جو انشاء اللہ تعالیٰ بہتوں کے لئے رُشد و ہدایت کا باعث ہوگی ۔

بشیر طارق
سال چہارم (فنون)

"چومتا ہے جن کی پیشانی کو جھک کر آسماں"

جب سے پاکستان معرضِ وجود میں آیا ہے ہمیں کئی بار ہندو استعماریت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ تقریباً ہر معرکے میں اور ہر مشکل وقت میں پاک فوج کے جیالے فرزندوں نے جرأت و بہادری اور عزم و ہمت کی ایسی داستانیں اپنے خون سے رقم کی ہیں جو ہمیشہ ہمارے دلوں کو گرماتی رہیں گی ——— ہماری افواج نے نہ صرف بحیثیتِ مجموعی اپنی فنی قابلیت اور مہارت کا لوہا دنیا سے منوایا ہے بلکہ انفرادی طور پر بھی ہمارے شیر دل بہادروں نے اپنے جذبۂ حب الوطنی اور قوتِ ایمانی کے بل بوتے پر "عسکری تاریخ" میں اپنا ایک منفرد مقام پیدا کر لیا ہے۔ ایسے سینکڑوں واقعات بیان کئے جا سکتے ہیں جن میں قوم کے ان سپوتوں نے مروّج طریقہ ہائے جنگ اور "فنِ حرب" کے بنیادی اصولوں کے برعکس ایسے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں کہ پوری قوم کا سر فخر سے بلند ہو گیا ہے۔ ہمارے سپاہیوں نے جس شجاعت اور دلیری سے ہندو جارحیت کے دانت کھٹے کئے ہیں اس پر ساری قوم کو فخر ہے اور وہ ہمیشہ ان پر نازاں رہے گی۔

——— اپنے جانباز سپاہیوں کی جرأت و بہادری کے انہی محیّر العقول کارناموں اور ان کی اعلیٰ فنی صلاحیتوں کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لئے صدرِ پاکستان کی جانب سے انہیں مختلف اعزازات عطا کئے جاتے ہیں۔ یہ فوجی اعزاز اِس بات کی ضمانت ہوتے ہیں کہ ساری قوم کو اپنے ان فرزندوں پر ناز ہے اور وہ ان کی عظیم قربانیوں کو تسلیم کرتے ہوئے ان کے لئے تشکر و آفرین کے جذبات رکھتی ہے ——— یہاں ہرگز اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ اعزاز کسی معاوضے کی حیثیت رکھتے ہیں یا جو سپاہی ان سے محروم ہیں وہ خدانخواستہ بہادر نہیں بلکہ یہ تو پاکستانی قوم کا ایمان ہے کہ ہمارا ہر سپاہی شہادت کے اس عظیم جذبہ سے سرشار ہے جو ملکی سرحدوں کی حفاظت کرتے ہوئے حاصل ہو۔ سبھی جانباز ایک دوسرے سے بڑھ کر ہیں لیکن جن کے کارناموں کی تفاصیل افسرانِ بالا تک پہنچ جاتی ہیں ان کے لئے ان اعزازات کا اعلان کیا جاتا ہے۔

پاکستان کا سب سے بڑا فوجی اعزاز "نشانِ حیدر" اب تک اُن سات خوش نصیبوں کو ملا ہے جنہوں نے اپنے خون سے اِس پاک سرزمین کی آبیاری کی ہے اور ملک کا دفاع کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا ہے۔ ان شہداء کے اسمائے گرامی یہ ہیں کیپٹن سرور شہید، میجر طفیل شہید، میجر عزیز بھٹی شہید، پائلٹ افسر راشد منہاس شہید، میجر اکرم شہید،

میجر شبیر شہید اور سوار محمد حسین شہید۔ آخر الذکر تین شہیدوں کو یہ اعلیٰ ترین فوجی اعزاز حالیہ جنگ میں بے مثال شجاعت و بہادری اور اعلیٰ کارناموں پر دیا گیا ہے۔ ذیل میں مختصر طور پر ان تین شہداء کے حالاتِ زندگی اور جنگی کارناموں کا تذکرہ کیا جاتا ہے:۔

میجر محمد اکرم ملک شہید

میجر محمد اکرم شہید جنہوں نے مشرقی پاکستان میں ہلی کے محاذ پر وطن کا دفاع کرتے ہوئے اپنی جان قربان کی۔ ۴ اپریل ۱۹۳۸ء کو ضلع گجرات کے ایک قصبہ ڈنگہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ملک سخی محمد صاحب ضلع جہلم کے ایک گاؤں نکا کلاں میں رہائش پذیر ہیں۔ آپ کے تین اور بھائی بھی پاک فوج میں ہیں۔ ملک اکرم اپنے گاؤں میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد سرائے عالمگیر کے فوجی سکول میں داخل ہو گئے اور کامیاب ہونے پر فوج میں کمیشن کے لئے درخواست دی مگر ناکامی کی صورت میں ۱۹۵۱ء میں وہ ایک سپاہی کی حیثیت سے فوج میں بھرتی ہو گئے۔ مشرقی پاکستان میں جب وہ لانس نائیک تھے تو ۱۹۵۵ء میں انہیں کمیشن ملا۔ وہ زیادہ عرصہ مشرقی پاکستان میں ہی متعین رہ کر خدمات بجا لاتے رہے اور بالآخر وہیں پر اُن کی شہادت بھی ہوئی۔

میجر اکرم طبعاً کم گو، مخلص، نیک اور پاکیزہ اخلاق کے انسان تھے۔ وہ پانچ وقت کے نمازی تھے اور فوج کی ملازمت کو ایک اعلیٰ اعزاز تصور کرتے تھے۔ اُن کی بہادری کی مثال اُن کے اُن خطوط سے بھی ملتی ہے جو اُنہوں نے محاذِ جنگ سے اپنے گھر لکھے۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ اسلام اور وطن کی خاطر قربان ہونا ہمارے لئے باعثِ افتخار ہے۔

حالیہ جنگ میں وہ ہلی کے محاذ پر تعینات تھے اور ایک سرحدی چوکی پر کمپنی کمانڈر کی حیثیت سے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ اس محاذ پر آپ نے جس بہادری اور شجاعت کا مظاہرہ کیا وہ تاریخ میں ایک سنہری باب کے طور پر ہمیشہ روشن رہے گا۔ آپ نے صرف دو کمپنیوں کی مدد سے دو ڈویژن بھارتی فوج کا حملہ آخری وقت تک روکے رکھا جبکہ بھارتی فوج کو ٹینک سکواڈرن اور فضائیہ کی مدد بھی حاصل تھی۔ دشمن کے حملہ کا مقصد ریلوے لائن کو کاٹنا اور اس علاقہ میں موجود پاکستانی فوج کو اسلحہ اور رسد سے محروم کرنا تھا۔ پندرہ روز تک دشمن بار بار حملے کرتا رہا لیکن نتیجہ اس کی ہزیمت کے سوا کچھ نہ نکلا۔ دشمن کی ناکامی کا راز میجر اکرم شہید کی بے مثال قیادت، منصوبہ بندی اور پاک فوج کے جذبۂ ایمانی میں مضمر تھا۔ قدرت میجر اکرم شہید کے اس عزم کو سچ ثابت کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ چنانچہ جب تک وہ زندہ رہے دشمن پاکستانی علاقہ میں ایک انچ بھی آگے نہ بڑھ سکا۔ شہید نے اپنے اس عزم کو سچ ثابت کر دکھایا اور دنیا و آخرت میں سرخرو ہو گیا۔

میجر شبیر شریف شہید

میجر شبیر شریف حالیہ جنگ کے دوسرے شہید ہیں جنہیں "نشانِ حیدر" کا عظیم فوجی اعزاز دیا گیا ہے۔ اُنہوں

نے بھی حسبِ روایت جرأت، بہادری، بلند حوصلگی اور نظم و ضبط کی ایک درخشندہ مثال قائم کی ہے اور شہادت کے رُتبہ سے سرفراز ہو کر اپنی ان عظیم اور گرانقدر قربانیوں کے حق میں مہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے۔

میجر شبیر ۲۸ اپریل ۱۹۴۳ء کو کنجاہ ضلع گجرات میں پیدا ہوئے اور ۱۹۶۴ء میں فوج میں کمیشن حاصل کیا۔ میجر شبیر شروع سے ہی بہت ہونہار اور محنتی تھے۔ چنانچہ فوجی تعلیم کے خاتمہ پر "اعزازی تلوار" حاصل کر کے فوج میں اپنے شاندار اور عظیم مستقبل کا آغاز کیا اور جس کا انجام "نشانِ حیدر" جیسے اعلیٰ اعزاز کو حاصل کرنے پر ہوا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران انہوں نے اعلیٰ کارناموں پر "ستارۂ جرأت" کا اعزاز بھی حاصل کیا تھا۔

میجر شبیر بے حد ذہین اور بہادر تھے اور ان کا دل جذبۂ جہاد سے پوری طرح سرشار تھا۔ انہوں نے اپنے ایک خط میں لکھا کہ "میں کسی کی غلامی قبول کرنے کے مقابلہ میں اپنی جان دینا زیادہ پسند کروں گا"۔ چنانچہ انہوں نے اپنے قول کو پورا کیا اور اپنی جان کی بازی لگا کر پوری قوم کی آزادی کی حفاظت کر گئے ــــــ ۳ دسمبر کو جب دشمن نے مغربی پاکستان کی سرحدوں پر حملہ کیا تو میجر شبیر سلیمانکی سیکٹر میں متعین تھے۔ انہیں حکم ملا کہ وہ بھارت کے فوجی لحاظ سے اہم بند پر قبضہ کر لیں میجر شبیر شریف فرنٹیئر فورس کی ایک کمپنی کی کمان کر رہے تھے۔ حکم ملتے ہی وہ دشمن پر بجلی بن کر گرے اور آن کی آن میں دشمن کے کنکریٹ کے بنے ہوئے مورچے روند ڈالے۔ انہوں نے دشمن کی کئی چوکیوں پر قبضہ کرنے کے لئے بارودی سرنگوں اور ایک نہر کو بھی بڑی بہادری اور بے خوفی سے عبور کر لیا۔ نہر کے دوسرے کنارے پر دشمن کے پختہ مورچے اور دمدمے تھے۔ پاک فوج کے سپاہیوں نے میجر شبیر کے حکم پر دشمن پر بپھرے ہوئے شیر کی مانند حملہ کر دیا اور دشمن کو بھاری جانی و مالی نقصان پہنچا کر پسپا ہونے پر مجبور کر دیا اور اپنا مشن پورا کر لیا۔ اس معرکے میں انہوں نے دشمن پر بہت کاری ضربیں لگائیں۔ ۴ دسمبر کو دشمن نے ایک زبردست حملہ کیا۔ اس حملہ کے دوران میجر شبیر اپنے مورچے سے باہر نکل آئے اور بھارتی فوج کی چوتھی جاٹ کمپنی کے کمانڈر میجر نرائن سنگھ کو پکڑ کر اسی کی سٹین گن سے اُسے ہلاک کر دیا اور اُس کے قبضہ سے اہم نوعیت کی دستاویزات حاصل کر لیں۔ میجر شبیر اپنے ساتھیوں کی مدد سے دشمن کے پانچ بڑے حملے ناکام بنا دیئے اور دو بٹالین فوج کا صفایا کر دیا۔

بعد دوپہر دشمن نے بھاری توپ خانہ اور فضائیہ کی مدد سے دوبارہ ایک زبردست حملہ کیا۔ میجر شبیر نے توپ خود سنبھال لی اور بھارتی ٹینکوں کو نشانہ بنانے لگے۔ اسی دوران ایک گولہ انہیں لگا اور قوم کا یہ عظیم فرزند اپنا اہم مشن پورا کر کے جامِ شہادت نوش کر گیا ــــــ شہید کی والدہ نے اپنے بیٹے کی شہادت کی خبر سُن کر ان جذبات کا اظہار کیا "مجھے فخر ہے کہ میرے بیٹے نے دفاعِ وطن اور اسلام کی سربلندی کے لئے جان دے کر اپنے نام کی عظمت برقرار رکھی۔ میرے بیٹے کا نام ہمیشہ تاریخ میں زندہ رہیگا اور آئندہ نسلوں کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوگا"۔ بلاشبہ میجر شبیر اور ایسے ہی دوسرے شہیدوں نے اپنے خونِ جگر سے جس مشعل کو روشن کیا ہے وہ ہمارے لئے روشنی کے مینار کی حیثیت رکھتی ہے اور جس کے نور سے پوری قوم ہمیشہ منور ہوتی رہے گی۔

سوار محمد حسین شہید

حالیہ پاک، بھارت جنگ میں محمد حسین شہید پہلے سپاہی ہیں جنہیں شجاعت و دلیری کی اعلیٰ روایات قائم کرنے پر "نشانِ حیدر" عطا کیا گیا ہے۔ سوار محمد حسین نے شکر گڑھ کے محاذ پر ایک ایسے تاریخ ساز معرکے میں حصہ لیا جس میں دشمن نے اپنی پوری طاقت صرف کر دی لیکن پاکستان کے محمد حسین جیسے مایۂ ناز سپوتوں نے جانفروشی اور جاں سپاری کی بے مثل روایات قائم کرتے ہوئے دشمن کے غرور کو خاک میں ملا دیا۔

محمد حسین ۱۸ جون ۱۹۴۹ء کو تحصیل گوجر خان کے گاؤں موڑا حیات میں پیدا ہوئے اور ۱۹۶۶ء میں ہلکی گاڑیوں اور ٹینک ڈرائیور کی حیثیت سے فوج میں شامل ہوئے۔ وہ اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے اور ان کے واحد کفیل تھے۔

جنگ میں عملی حصہ لینا شہید کے فرائض میں شامل نہیں تھا لیکن شوقِ شہادت کے جذبہ سے سرشار ہو کر وہ اپنے دوسرے ساتھیوں کے شانہ بشانہ جہاد کے لئے میدانِ جنگ میں کود گئے اور رضاکارانہ طور پر اپنے اصل فرائض کے علاوہ دشمن سے براہِ راست نبرد آزما ہونے کی پیشکش بھی کی جسے قبول کر لیا گیا۔ جب دشمن کی توپیں آگ برسا رہی ہوتی تھیں وہ پاک فوج کے ہر مورچے میں جاتے اور گولہ بارود پہنچاتے رہے۔ انہوں نے اپنے آپ کو مشکل سے مشکل مہم کے لئے پیش کیا اور قربانی و ایثار کے انمٹ نقوش اپنی یادگار چھوڑ گئے۔ ۹ دسمبر کو انہوں نے گاؤں ہڑ تھور کے سامنے دشمن کی نقل و حرکت دیکھی۔ انہوں نے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور تنہا ہی دشمن کے مقابلہ میں ڈٹ گئے اور دشمن کو روک لیا۔ اگلی صبح انہوں نے اس کی اطلاع کمانڈر کو دی اور تمام صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ وہ اپنے ساتھیوں کی راہ نمائی کرتے ہوئے صحیح نشانوں پر گولہ باری کرواتے رہے اور دشمن کے ۸ ٹینک اور بہت سا اسلحہ اور گولہ بارود تباہ کرنے کے علاوہ اس کو بھاری جانی نقصان بھی پہنچایا۔ سوار محمد حسین بے مثال جرأت و بہادری اور بامردی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دشمن کے مورچوں میں چلے گئے اور دشمن کی پوزیشنیں معلوم کر کے اپنے ساتھیوں کی اس سمت راہنمائی کی جس میں دشمن کی تباہی یقینی تھی۔ ان کے ساتھیوں کا بیان ہے کہ جس دلیری اور بے باکی سے محمد حسین یہ مشکل کام سرانجام دے رہے تھے اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ شخص گوشت پوست کا نہیں بلکہ فولاد کا بنا ہوا انسان ہے۔ جنگ کے دوران انہوں نے جس مستعدی، حاضر دماغی اور جوش و ولولہ کا مظاہرہ کیا اس سے قرونِ اولیٰ کے عظیم مجاہدوں کی یاد تازہ ہو گئی۔ اس ناقابلِ فراموش معرکے کے دوران محمد حسین شہید اپنے مورچے سے نکل کر دشمن کی پوزیشن معلوم کرنے کے لئے نکلے لیکن مشین گن کے ایک گولے سے شہید ہو کر پاک سرزمین کو اپنے خون سے لالہ زار بنا گئے۔ اپنی جان قربان کر کے انہوں نے دشمن کی پیش قدمی روک دی اور ایک سچے مجاہد کی حیثیت سے اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئے۔ !!

——— یہ وہ واقعات و حالات تھے جن میں حد درجہ بہادری اور دلیری کا مظاہرہ کرنے پر میجر اکرم، میجر شبیر اور

سوار محمد حسین کو "نشانِ حیدر" عطا کیا گیا ——— ان شہیدوں کے علاوہ ایسے بے شمار مجاہد ہیں جن کی جرأت و بہادری کے واقعات منظرِ عام پر نہ آسکے مگر فلک کج رفتار ان کی قربانیوں کا گواہ رہے گا۔ خدا کے حضور ان کی قربانیاں ضرور نوازی جائیں گی۔ ہم اپنے ان گمنام مجاہدوں کی رُوحوں کو ہدیۂ تہنیت پیش کرتے ہیں۔

ہمارے فوجی جوانوں نے جس بے مثل جانفروشی، دلیری اور پامردی کا ثبوت دیا ہے اس کے لئے پوری قوم ان کی احسان مند رہے گی۔ ہم ایک بامقصد جنگ لڑ رہے تھے اور ہمیں خدا کی ذات پر پُورا اعتماد تھا ——— آرزوئے شہادت نے ہمارے جوانوں کو موت سے بے خطر کر دیا تھا۔ وہ اِس عزم سے موت کی وادی میں اُترے کہ اگر موت آگئی تو شہید اور اگر زندہ بچے تو غازی ——— !! اِس عزم نے اکرم ملک، شبیر شریف اور محمد حسین جیسے شہیدوں کو رتبۂ شہادت سے ہمکنار کیا ایسے مایۂ ناز جوان پیدا ہوتے رہیں گے اور ملک و قوم کا نام روشن کرتے رہیں گے۔

سلام ان غازیانِ وطن پر جن کے لازوال جذبہ نے پاکستان کو حیاتِ نو عطا کی اور اسلام ان شہدائے وطن پر جن کے مقدس خون سے اِس پاک سرزمین کی آبیاری ہوئی ——— شہیدوں کا خون رائیگاں نہیں گیا بلکہ انہوں نے اپنے مقدس خون سے مادرِ وطن کی عزت کو قائم رکھا، انہوں نے پُوری قوم کی آزادی کی حفاظت کی اور انہوں نے اپنے آج کو ہمارے کل کے لئے قربان کر دیا۔ وہ خود تو موت کی وادی میں چلے گئے لیکن ساری قوم کے لئے جینے کے سامان کر گئے ——— خدا ان سب کو غریقِ رحمت کرے۔ !! علامہ اقبال نے شاید انہی شہیدوں کے لئے کہا تھا کہ ؎

شمع کی مانند جئیں بزم گہِ عالم میں
خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

روشن ستارے ——— بقیہ صفحہ ۲۸

آپ اور آپ کے ساتھیوں نے رذیل دشمن کے ہاتھوں قید ہونے کی بجائے وہاں سے فرار ہونے کا منصوبہ بنایا۔ اور ۱۶ر دسمبر کو علی الصبح ایک ہیلی کاپٹر میں سوار ہو کر برما کی طرف روانہ ہو گئے۔ دشمن کی توپوں نے ہیلی کاپٹر تباہ کرنے کے لئے پے در پے گولے برسانے شروع کر دیئے لیکن یہ سب موت سے بے خطر ہو کر برما کی جانب بڑھتے رہے۔ اِس دوران دشمن کی گولی سے پائیلٹ بھی زخمی ہو گیا۔ مگر پائیلٹ نے ہمت نہ ہاری اور ہیلی کاپٹر کو رنگون کے ہوائی اڈے پر اُتار کر ہی دم لیا۔ یہاں سے اِن سب کو پی۔ آئی۔ اے کے طیارے کے ذریعے پاکستان کے مغربی حصہ میں پہنچا دیا گیا۔

آجکل آپ بطور ۶۸۰ III آپریشنز ڈھاکہ میں متعین ہیں +

ایسے بہادر جوانوں کا تذکرہ ابھی باقی ہے جو المنار کے آئندہ شماروں میں ہدیۂ قارئین کیا جائے گا انشاءاللہ (ادارہ)

محمد داؤد منیر
سال چہارم (فنون)

روشن ستارے

یُوں محسوس ہوتا ہے جیسے اب ہمارے سینے میں ایسی کوئی آہ موجود نہیں جس کا دھواں اس محفل کی فضا میں تحلیل ہو سکے۔ اب تو ہماری آنکھوں کے سامنے کوئی ایسا آنسو بھی تیرتا دکھائی نہیں دیتا جس سے یہ کاغذ نم آلود ہو جائے۔ زیرِ نظر شمارہ سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد کا پہلا شمارہ ہے۔ جی چاہتا ہے کہ تعلیم الاسلام کالج کے اُن یارانِ قدیم کی یاد میں ایک چھوٹی سی محفل برپا کریں جنہوں نے وطنِ عزیز کی خاطر کسی قربانی سے دریغ نہ کیا۔ ان میں سے کچھ شہید ہوئے، کچھ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد اب تک دشمن کی قید میں ہیں اور کچھ ابھی تک سرحدوں پر بیٹھے کسی اشارے کے منتظر ہیں۔ قوم کے ان مایۂ ناز فرزندوں کو ہم سلام کہتے ہیں۔ کاش! ہم میں سے ہر ایک کو یہ علم ہو جائے کہ شہیدوں کے حسین سلسلے میں بسنے والے مرنے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں، تا ابد زندہ و پائندہ ——— یہ زمین و آسماں چکر کھاتے کھاتے تھک جائیں مگر اُن کے کفن میلے نہ ہو سکیں گے ——— آیئے اب ذرا ان صف شکن مجاہدوں کے کارناموں سے اپنے دل گرمائیں جو کبھی اسی کالج کے کمروں میں بیٹھتے تھے اور انہی روشوں پر گھوما کرتے تھے۔

۱۔ ۱۹۴۹ء کا ذکر ہے تعلیم الاسلام کالج میں منیر نامی ایک لڑکا ایف۔ اے کا طالبعلم تھا۔ منیر ایک ایسے دور کا طالبعلم تھا جبکہ ۱۹۴۷ء کے قیامت خیز انقلاب سے امن و چین اور سکون کے دن مبدل ہو گئے تھے۔ نہایت بے بسی اور کسمپرسی کی حالت میں لاہور میں تعلیم الاسلام کالج کا آغاز ہوا۔ لٹے پٹے طلباء دن کو جن صفوں پر بیٹھ کر اساتذہ کے لیکچر سنتے رات کو انہی صفوں پر سو رہتے۔ دُبلا پتلا مگر چاک و چوبند منیر شروع ہی سے خاموش طبع تھا۔ ہاکی کا اتنا اچھا کھلاڑی کہ کالج کو اس پر فخر تھا۔ اس کے علاوہ گاف کا بھی حد درجہ شوقین تھا۔ جب کبھی دوستوں کے ساتھ بیٹھتا تو فضاؤں کی باتیں ہی کرتا ——— پاکستان نیا نیا بنا تھا، دشمن اسے ہر طرح سے نقصان پہنچانے کے درپے تھا۔ فضاؤں میں ہر وقت طیاروں کی گھن گرج سُنائی دیتی رہتی۔ منیر جب کبھی کسی طیارے کی گھن گرج سُنتا فوراً کلاس سے باہر نکل کر اسے دیکھنے لگتا اور اُس کی نگاہیں دُور تک جہاز کا پیچھا کرتیں۔ جب جہاز آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا تو وہ ایک ٹھنڈی آہ بھر کر نصاب کی کتابیں پرے پھینکتا اور سوچوں کی دُنیا میں کھو جاتا۔ منیر کا فضا میں اُڑنے کا ہوا شوق اُسے کالج کی چار دیواری سے نکال کر ایک فلائنگ کلب میں لے آیا جہاں وہ دو سال تک فضائی تربیت حاصل کرتا رہا۔ چُپ چاپ رہنے والا وہی منیر اب کافی ہنس مُکھ ہو چکا تھا۔ دوستوں سے انتہائی خوش خُلقی سے پیش آتا۔ فلائنگ کلب میں دو سال گزارنے کے بعد ۱۹۵۱ء میں وہ پاک فضائیہ سے منسلک ہو گیا۔ پی۔ اے۔ ایف سکول کے سیبر ہاؤس میں منیر کا نام اس کی ہمدردی، خوش خُلقی اور محبت و مودت کی وجہ سے اتنا مشہور ہوا کہ بعد میں یہی سیبر ہاؤس منیر ہاؤس کہلانے لگا۔ رفتہ رفتہ منیر اپنے فن میں اتنا ماہر ہو گیا کہ اس کی ہوا بازی کی دھاک غیروں کے دل پر بھی بیٹھ گئی۔ ۲۲ سال کا منیر اب ۳۸ سال کو پہنچ چکا تھا۔ اب اسے سکواڈرن لیڈر خلیفہ منیر الدین کے نام سے پکارا

جانے لگا۔ ۱۹۶۵ء کے افق پر ستمبر کا مہینہ طلوع ہوا۔ ناپاک اور عیار دشمن نے پاکستان پر جنگ مسلط کر دی۔ جہاں زمینی توپوں کے دہانے کھلے وہاں پاک فضائیہ بھی حرکت میں آ گئی۔ منیر کے ساتھی فضاؤں میں جاتے اور دشمن پر کاری ضربیں لگاتے لیکن منیر کی جبین کی شکنت آڑے آئی اور اُسے تمام فضائی مہمات سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا۔ منیر آزردہ خاطر ہو گیا۔ وہ تو فضاؤں کا مسافر تھا جسے زمین پر قید کر دیا گیا تھا ؎

قفس میں ہم تھے گھری یادوں میں بجلی تھی ؛ تڑپ تڑپ کے رہے دونوں آشیاں کے لئے

منیر اپنے ماتحتوں سے التجا کرتا کہ خدارا تم میرا کام سنبھالو اور مجھے فضاؤں میں جانے دو۔ چنانچہ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ منیر نے کسی اور افسر کو اپنے کام پر متعین کیا اور خود جہاز لیکر فضاؤں میں کود گیا۔ ۱۱ ستمبر کا دن تھا آج پاک فضائیہ کو ایک اہم کام سرانجام دینا تھا۔ امرتسر کے راڈار اسٹیشن کو تباہ کرنے کا کام۔ منیر بضد تھا کہ اُسے بھی اس خطرناک مشن پر بھیجا جائے۔ چنانچہ ونگ کمانڈر شمیم احمد کی سرکردگی میں ۴ جہازوں کا گروپ اس اہم مشن پر روانہ ہوا۔ جہاز ہدف پر پہنچے سکواڈرن لیڈر منیر کو حملہ کرنے کا حکم ہوا۔ منیر نے غوطہ لگایا مگر بم پھینکے بغیر باہر آ گیا اور ساتھ ہی اپنے ساتھی کو بتایا کہ نشانہ ٹھیک نہیں بیٹھا۔ امرتسر کا راڈار اسٹیشن شہری آبادی میں یوں چھپا ہوا تھا کہ ماہر سے ماہر ہوا باز بھی اس کا کھوج نہ لگا سکتا تھا۔ دوسری مرتبہ بھی یونہی ہوا۔ اگر منیر کو شہری آبادی کی تباہی کا خطرہ نہ ہوتا تو وہ ضرور بم گرا دیتا لیکن وہ تو رحم و الفت کا پیکر تھا بے گناہ شہریوں کو کیسے نشانہ بناتا۔ تیسری مرتبہ منیر نے پھر غوطہ لگایا اور اتنی نیچے چلا گیا کہ اُسکے دوسرے ساتھی حیران رہ گئے اور اسکے ساتھ ہی امرتسر کے راڈار اسٹیشن پر قیامت بپا ہو گئی۔ منیر نے نشانے لیکر راکٹ چھوڑے اور راڈار کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ ابھی منیر غوطہ سے باہر نہ نکلا تھا کہ مخالف سمت سے طیارہ شکن توپوں نے یکدم گولوں کی بوچھاڑ کر دی۔ گولیوں کی ایک باڑ منیر کے سیبر جیٹ طیارے کو پاش پاش کر گئی اور خوش خُلق و زندہ دل اور پاک فضائیہ کا چہیتا ہوا باز ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ جاوید ہو گیا۔ منیر کی اس بے مثال جرأت اور بہادری پر اسے ستارۂ جرأت کا اعزاز دیا گیا۔ اے تعلیم الاسلام کالج کے پُرشکوہ و پُروقار طالبعلم! تجھ پر ساری قوم فخر کرتی ہے۔ ہم عہد کرتے ہیں کہ ہم تیری یاد کے تمام نقوش ابد تک اپنے سینوں پر سجائے رکھیں گے کہ تُو نے ہمارے سر فخر سے بلند کر دیئے ہیں۔!

۱۹۶۵ء میں منیر جیسے بہادروں اور جانبازوں نے دشمن کے دانت کھٹے کر دیئے تو اس نے اپنی شکست کا بدلہ چکانے کیلئے دسمبر ۱۹۷۱ء میں تمام بین الاقوامی اصولوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے پاکستان پر پھر بزدلانہ حملہ کیا۔ اس جنگ میں بھی ہمارے کالج کے سابق طلبہ نے بہادری و جاں نثاری کے بے مثال کارنامے سرانجام دیئے۔

۲۔ نسیم سیفی ـــــ سانولی سی رنگت والا اور دوہرے جسم کا مالک یہ طالبعلم تعلیم الاسلام کالج میں اپنی پُرکشش شخصیت اور میٹھی میٹھی باتوں کی وجہ سے بڑا ہر دلعزیز تھا۔ اپنے زمانے کا بہترین مقرر اور ہونہار طالبعلم، سیفی مشرقی پاکستان کے جیسور کے سیکٹر پر دشمن کے سامنے سینہ سپر تھا۔ اُس کا چہرہ پُرعزم تھا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے اپنے ازلی و ابدی دشمن کو صفحۂ ہستی سے

مشاکر ہی دم لیگا۔ ۱۵ر دسمبر کو جب سیفی کو علم ہوا کہ ہتھیار ڈالنے جا رہے ہیں تو وہ حیران رہ گیا۔ فوراً ڈھاکہ میں اپنے دوست کیپٹن لطیف سے فون پر رابطہ قائم کیا اور پوچھا "سنا ہے کہ ہتھیار ڈالے جا رہے ہیں" کیپٹن لطیف نے اس خبر کی تصدیق کی تو بڑے جوش سے کہا "لیکن میرا ہتھیار ڈالنے کا کوئی ارادہ نہیں" یہ سیفی کی آخری گفتگو تھی۔ اس کے بعد اب تک اس کے متعلق کسی قسم کا کوئی علم نہیں ہو سکا تھا۔ اب کچھ عرصہ پیشتر سیفی کی خیریت کی اطلاع مل گئی ہے۔ الحمد للہ۔

ایک انسان کی زندگی کا حاصل اور ایک مسلمان کی کشمکش حیات کا آخری ہدف یہ ہے کہ وہ اسلام کی راہ میں پیش آنیوالے تمام مصائب و مشکلات کو خندہ پیشانی سے برداشت کرے اور اس سلسلے میں کسی قربانی سے بھی دریغ نہ کرے چنانچہ اس سلسلے میں کیپٹن نسیم سیفی نے ۲۵ر نومبر کو مشرقی پاکستان سے اپنے گھر والوں کو جو خط لکھا اس کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

"خدا تعالیٰ کا فضل اور اس کا رحم قدم قدم پر میرے ساتھ ہے۔ وہ میری خود حفاظت فرما رہا ہے اور مجھ سے کام لے رہا ہے۔ اس کا احساس مجھے پچھلے چند روز سے ہو گیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ ... اللہ تعالیٰ مجھ پر ہر قسم کا فضل کریگا۔ میری ہر مشکل آسان کریگا اور مجھے ہر آزمائش میں ثابت قدم رکھے گا"

نسیم سیفی

یاد رہے کہ نسیم سیفی تعلیم الاسلام کالج یونین کے صدر بھی رہ چکے ہیں۔

۳۔ کیپٹن خلیل نے ۱۹۶۴ء میں تعلیم الاسلام کالج سے بی۔ اے کا امتحان اعلیٰ نمبروں میں پاس کیا۔ ۱۹۶۶ء میں پاک فوج میں کمیشن ملا اور اس کے بعد اگست ۱۹۷۰ء میں وطن عزیز کے دفاع کے لئے مشرقی پاکستان بھیج دیئے گئے جہاں آپ کو سلہٹ کے مقام پر متعین کیا گیا جہاں سے پھر برہمن باڑیہ (کومیلا سیکٹر) بھیج دیا گیا۔ مارچ ۱۹۷۱ء میں جب فسادات نے زور پکڑ لیا اور مشرقی پاکستان میں خونریز لڑائی شروع ہو گئی اور بنگالی پاکستانی افواج کے غیر بنگالی افسروں کو موت کے گھاٹ اتارنے لگے تو آپ کی کمپنی کے تمام افسر اور جوان شہید ہو گئے مگر خدا تعالیٰ نے معجزانہ اور حیرت انگیز طور پر آپ کو دشمن کی گزند سے محفوظ رکھا۔ میدانِ جنگ سے آپ نے اپنی والدہ کو جو خط لکھا وہ ایک دلیر نڈر اور محبِ وطن مجاہد کے جذبات کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔

"میں بالکل خیریت سے ہوں۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔ مومن موت سے نہیں ڈرتا۔ موت تو چارپائی پر بھی آجاتی ہے۔ خدا کے فضل سے ہم نے دشمن کے مکارانہ حملہ کو بُری طرح پسپا کر دیا ہے۔ دشمن کا وہ حال ہوا ہے کہ یاد رکھے گا۔ ابھی تک میدان میں لاشیں بکھری پڑی ہیں"

خلیل احمد

کالج میں تعلیم کے دوران آپ فٹ بال کے بہترین کھلاڑی تھے اور کالج ٹیم کے کپتان بھی تھے۔ اس وقت آپ دشمن کی قید میں ہیں۔

۴۔ تعلیم الاسلام کالج کے ایک اور ہونہار سابق طالبعلم کیپٹن لطیف احمد بھی ملک کے مشرقی حصہ میں دشمن سے برسرِ پیکار تھے آپ کو اپریل ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان بھجوایا گیا جہاں آپ بطور ۶۸۰ III مشرقی کمان کے ٹریننگ ہیڈ کوارٹر ڈھاکہ میں متعین ہوئے۔ سقوط ڈھاکہ کے دن یعنی ۱۶ر دسمبر کو آپ بذریعہ ہیلی کاپٹر چند اور ساتھیوں کے ساتھ مشرقی پاکستان سے فرار ہو کر برما پہنچے۔ مشرقی پاکستان سے برما پہنچنے کا واقعہ بھی نہایت دلچسپ ہے۔ جب ڈھاکہ میں ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ ہوا تو

(باقی صفحہ ۲۹ پر)

کالج یونین کے تحت

ـ کل پاکستان بین الکلیاتی مباحثات ـ

پروفیسر ڈاکٹر سید سلطان محمود شاهد
(نگران یونین)
اردو مباحثه کے اختتام پر
طلبه سے
خطاب فرما رهے هیں

سامعین همه تن
گوش هیں

طیب عارف
(قائد ایوان انگریزی مباحثه)

عبدالحمید عبدالرحمان
(قائد حزب اختلاف انگریزی مباحثه)

جناب ڈاکٹر اسرارالحق وائس چانسلر زرعی یونیورسٹی لائل پور اور پروفیسر
محمد علی چوھدری (پرنسپل) یونین کے عہدیداران کے ھمراہ

پروفیسر ڈاکٹر سید سلطان محمود شاھد انگریزی اردو مباحثات میں اول آنے
پر طاھر عارف شعبہ معاشیات پنجاب یونیورسٹی لاھور اور سید طیب محمود
یونیورسٹی لاء کالج لاھور کو گولڈ میڈل دے رھے ھیں -

تھے۔ زباں پر انہیں غیر معمولی قدرت تھی۔ روتوں کو ہنسانا اور ہنستوں کو رُلانا اُن کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

صبحِ اُمید :۔

لکھنؤ کے ایک خوش مزاق ادیب، پنڈت برج نرائن چکبیت اس کے مدیر تھے۔ نثر بھی اچھی لکھتے تھے اور شعر بھی عمدہ کہتے تھے وسیع النظر تھے۔ اندازِ بیان سنجیدہ اور محققانہ تھا۔ نقدہ تبصرہ کرتے تھے تو تمام موافق و مخالف پہلوؤں کو اُجاگر کر دیتے تھے۔

اُودھ اخبار :۔

ایک زمانے میں پنڈت رتن ناتھ سرشار اس کے ایڈیٹر تھے۔ انہوں نے اِس اخبار میں بہت زیادہ ادبی خوبیاں پیدا کر دی تھیں۔ اُن کا مشہور کارنامہ "فسانۂ آزاد" پہلے پہل اسی اودھ اخبار میں شائع ہوا تھا۔ پھر کافی عرصہ کے بعد کچھ ردّوبدل اور حذف و اضافے کے ساتھ کتابی صورت میں شائع ہوا۔ اِس اخبار کی ادبی حیثیت سرشار کے بعد یکسر ختم ہو گئی۔

مورّخ :۔

یہ ایک تاریخی رسالہ تھا۔ مولانا عبدالحلیم شرر اس کے ایڈیٹر تھے۔ رسالہ اچھا تھا لیکن زیادہ دیر نہیں چلا۔

مخزن :۔

شیخ عبدالقادر کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ وہی شیخ عبدالقادر جو بعد میں پنجاب کی کونسل کے صدر، پھر پنجاب کے وزیرِ تعلیمات، بعد ازاں لاہور ہائیکورٹ کے جج، پھر لندن میں وزیرِ ہند کے مشیر، آخر میں عارضی طور پر چوہدری سر محمد ظفراللہ خان صاحب کی جگہ وائسرائے کونسل کے ممبر قانون مقرر ہوئے۔ اُردو کا بڑا ستھرا ذوق رکھتے تھے۔ ذاتی دَور کے ہر دَور میں اُردو سے اُن کی شیفتگی برابر قائم رہی۔ مُلک کے چوٹی کے رسالوں میں مخزن کا شمار ہوتا تھا۔ اُس نے ایک نئی طرح قائم کی۔ پاکیزہ، ستھرا اور کارآمد لٹریچر مخزن کا طغرائے امتیاز تھا۔ اس کے لکھنے والوں میں علامہ اقبال، چوہدری خوشی محمد ناظر، مولانا راشد الخیری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ شیخ عبدالقادر خود بہت کم لکھتے تھے لیکن ترتیبِ مضامین کے فن میں ماہر تھے۔ حضرت بانیٔ سلسلہ عالیہ احمدیہ کے فرزندِ اکبر حضرت صاحبزادہ مرزا سلطان احمد صاحب بھی اس پرچہ میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ خیالی اور نیم تحقیقی مقالات خوب لکھتے تھے۔ طول نویس بھی بہت تھے۔

نقیب :۔

بدایوں سے نکلتا تھا۔ وحید احمد اس کے ایڈیٹر تھے۔ بہت بلند پایہ مضامین اس میں شائع ہوتے تھے

اس کے مضمون نگاروں میں قاضی عبدالغفار اور مہر محفظ علی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اِس پرچے میں سیاسی مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ علی برادران کا یہ "نقیب" تھا۔

معلومات :-

لکھنؤ سے نکلتا تھا۔ حکیم عبدالوالی مرحوم اس کے ایڈیٹر تھے۔ والی مرحوم کا طرزِ فکر و نظر برنارڈ شا سے ملتا جلتا تھا۔ وہی بے باکی و صاف گوئی۔ اِس پرچے کے مضمون نگاروں میں چوہدری محمد علی اپنے دلچسپ طنزیات کے لئے مقبول تھے۔

کہکشاں :-

یہ پرچہ سید امتیاز علی تاج لاہور سے نکالتے تھے۔ ادبی پرچہ تھا۔ علمی اور تحقیقی مقالات بھی اس میں شائع ہوتے تھے۔ پریم چند، راشد الخیری، خواجہ حسن نظامی، سجاد حیدر اور مولانا عبدالمجید سالک جیسے لوگ اس کے مستقل مضمون نگاروں میں تھے +

"رسالہ ساقی پڑھیئے۔ کورے لٹھے پر شائع ہوتا ہے۔ خالص پاپلین کی جلد ہے جسے دیکھ کر آنکھیں چکا چوند ہو جاتی ہیں۔

ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی

رسالہ ہمایوں ہر یکم تاریخ کو نہایت باقاعدگی سے چھبیس نمبر کی ململ پر شائع ہوتا ہے۔ اِس رسالے نے آج تک کھدر استعمال نہیں کیا۔

دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

رسالہ ادبِ لطیف پڑھیئے۔ ہندوستان کا واحد ترقی پسند ماہنامہ ہمیشہ ہاتھ کا بُنا ہوا دو سُوتی کپڑا استعمال کرتا ہے۔ رسالہ ادبِ لطیف پڑھیئے اور اپنے مُلک کے جولاہوں کی مدد کیجئے۔ مزدور کسان زندہ باد۔"

(کرشن چندر)

تنویر احمد
(اولڈ بوائے)

تحفہ

(افسانہ)

جبین اور جم اپنے کرائے کے چھوٹے سے فلیٹ میں بڑی پُر مسرت ازدواجی زندگی گزار رہے تھے۔ جم معمولی تنخواہ پر ایک فرم میں ملازم تھا۔ مشکل سے گزر بسر ہوتی۔ کیونکہ تنخواہ کا بیشتر حصہ اُس فلیٹ کے کرائے کی نذر ہو جاتا۔ دونوں میاں بیوی میں بے پناہ محبت تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر جیتے تھے۔ جبین تھی بھی بڑی خوبصورت۔ جم اُس کی گھٹنوں تک لمبی زلفوں کے سائے میں دفتر سے تھکا ہارا لوٹ کر بڑا سکون محسوس کرتا۔ وہ جب کبھی نہانے کے بعد اپنی لمبی زلفوں کو سکھانے کے لئے اُنہیں کھڑکی سے باہر لٹکا کر کھڑی ہوتی تو ایسا محسوس ہوتا کہ ساون کی کالی گھٹا سے پھوار برس کر کھڑکی کے نیچے اُگے ہوئے پودوں کو نکھار بخش رہی ہو۔ جم کو اِن زلفوں سے بڑا ہی پیار تھا۔ وہ گھنٹوں اِن زلفوں میں انگلیاں پھیر کر گھنگھریالے بالوں کے اُلجھاؤ کو سنوارتا۔ جبین کے پاس بس یہی ایک دولت تھی۔ جم کے پاس ایک پُرانی سنہری رنگ کی گھڑی جو اُسے اپنے آباؤ اجداد سے ورثہ میں ملی تھی اور وہ اِسے بزرگوں کی نشانی سمجھ کر اُس کی بڑی تعظیم کرتا لیکن اس گھڑی میں جین نہیں تھا جس کی بدولت وقت دیکھنے کے لئے اُسے گھڑی کو بار بار جیب سے نکالنا پڑتا اِن دو چیزوں کے علاوہ اُن کے ہاں کوئی قابلِ ذکر چیز نہ تھی۔

ایک روز جم دفتر سے ابھی تک نہ لوٹا تھا۔ جبین اُس روز بڑی پریشان تھی کیونکہ دوسرے روز کرسمس تھا اور اُس کے پاس صرف ایک پاؤنڈ اور چند شلنگ کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اتنے کم پیسوں سے وہ جم کے لئے کوئی تحفہ نہ خرید سکتی تھی۔ آخر یہ سوچتے سوچتے وہ رو دی اور بڑی حسرت سے آہ بھر کر پیسوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آخر یہ بڑھ کیوں نہیں جاتے"

وہ انہی پیسوں کو جنہیں وہ پائی پائی کر کے جم کے تحفہ کے لئے جمع کرتی رہی تھی لے کر بازار گئی۔ اچانک اُس کی نظر بالوں کا کاروبار کرنے والی ایک کمپنی کی دوکان پر پڑی۔ وہ ایک دم اس دکان میں داخل ہو گئی اور پھولے ہوئے سانس سے دوکان کی مالکہ سے پوچھا۔

"کیا آپ میرے بال خریدیں گی؟"

اُس عورت نے جبین کے خوبصورت بالوں کا بغور جائزہ لیا اور خریدنے پر تیار ہو گئی۔ جبین نے معاوضے کے بارے میں استفسار کیا تو اُس نے کہا۔

"میں آپ کو بیس پاؤنڈ دے سکتی ہوں"

جبین فوراً رضامند ہو گئی اور بال کٹوانے کے بعد ایک انجانی خوشی سے سرشار بیس پاؤنڈ تھامے کسی جنرل اسٹور کی تلاش

میں نکلی۔ وہ کئی دوکانوں پر گئی مگر اُسے کوئی تحفہ پسند نہ آیا۔ آخر کار ایک دکان پر اُسے گھڑی کا ایک خوبصورت چین نظر آیا۔ اُس نے وہ چین اکیس پونڈ کے عوض خرید لیا۔ اُس چین کی کڑیوں کی کئی رُخی سطح پر جب روشنی کی کوئی کرن پڑتی تو اُس سے لاتعداد روشنی کے فوارے پھوٹ پڑتے جو ایک چاہنے والے کی اپنے محبوب سے محبت کی عکاسی کرتے۔

وہ یہ تحفہ لے کر دوڑی دوڑی گھر پہنچی اور اسے چھپا کر ایک کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے میں اپنی صورت دیکھی۔ اور یہ دیکھ کر بے حد خوش ہوئی کہ وہ پہلے سے بھی کچھ زیادہ حسین نظر آ رہی ہے، اگرچہ حقیقتِ حال اس کے برعکس تھی اور یہ سوچ کر کہ جم بھی اُس کے اِس انداز کو ضرور پسند کرے گا خوشی خوشی باورچی خانے میں جا کر کھانا تیار کرنے لگی۔ لیکن آج اُسے کھانا تیار کرنے میں کچھ دیر ہوگئی اور جم کھانا تیار ہونے سے پہلے ہی دفتر سے لوٹ آیا اور بغل میں ایک پیکٹ دبائے کمرے میں داخل ہوا۔ اُس کے قدموں کی آہٹ سُن کر جلدی سے جین باورچی خانے سے نکلی اور آتے ہی بولی۔

"جم! میں نے اپنے بال کٹوا دیئے ہیں اب میں اچھی لگتی ہوں نا؟ اور ہاں تمہارے لئے بہت خوبصورت اور پیارا تحفہ لائی ہوں۔ دیکھو گے تو پسند آئے گا۔"

یہ سُنتے ہی جیسے جم پر بجلی گر پڑی۔ ایک دم بوکھلا گیا اور بولا۔

"تم نے بال کٹوا دیئے، جین تم نے یہ کیا کیا؟"

جین اُس کی پریشانی بھانپتے ہوئے بولی۔

"جم میرے پیارے جم! تم فکر نہ کرو میرے بال بہت جلد بڑھتے ہیں یہ چند ہی ماہ میں پھر لمبے ہو جائیں گے۔ ہاں تو میں دکھاؤں تمہیں اپنا تحفہ۔ بہت پیارا ہے، اِسے دیکھو گے تو بہت خوش ہو گے۔"

اور وہ بھاگ کر الماری سے گھڑی کا چین اُٹھا لائی اور جم کو تھما دیا۔ جم نے ایک لمبی آہ بھری اور قریب کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"میں بھی تمہارے لئے ایک تحفہ لایا ہوں" اور پیکٹ اپنی بغل سے نکال کر میز پر رکھ دیا۔ جین نے اُسے جلدی سے اُٹھا کر کھولنا شروع کر دیا اور پیکٹ کھلنے پر دو کنگھیاں، کچھ بالوں کے پن اور چند رنگ برنگے بالوں کے ربن نکلے۔ انہیں دیکھتے ہی جین مضطرب ہو گئی اور اپنی پریشانی چھپاتے ہوئے بولی۔

"اُف کتنا پیارا تحفہ ہے لیکن ..... لیکن؟"

پھر کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگی۔ "لیکن جم یہ تحفہ تم نے خریدا کیسے؟"

جم دُکھ بھری آواز میں بولا "میں نے وہ گھڑی بیچ دی جین!"

(او ہنری کے انگریزی افسانے سے ماخوذ)

سید اعجاز الحسن گیلانی
سال چہارم، علوم

افسانہ

"زود پشیماں"

پولیس انسپکٹر آفس ٹیبل پر کہنیاں جمائے ہاتھوں کے پیالے میں سر رکھے عالمِ فکر میں مستغرق بیٹھا تھا۔ پیشانی پر گہری شکنیں اس کی پریشانی کی غماز تھیں۔ آنکھیں فائل پر مرکوز تھیں۔ سوچوں کا محور اغوا کا ایک مقدمہ تھا جو مفید ہوتا ہوا سراس کے تجربے کا شاہد تھا۔ اپنی زندگی میں اُس نے کتنے معاملات چوری، ڈاکہ زنی، اغوا اور قتل کے نپٹائے تھے مگر اس دفعہ حالات اُسے شکست دینے پر پوری طرح آمادہ نظر آتے تھے۔ تصور ندیم، ملک کے نامور مصور کی بیوی کو گم ہوئے دو ماہ سے زیادہ عرصہ ہو چکا تھا مگر اس کا سُراغ نہیں مل رہا تھا۔ خدا جانے اُسے آسمان نے اُچک لیا یا زمین نگل گئی۔ سلسلۂ تفتیش کی جس کڑی پر ہاتھ ڈالا جاتا وہی موٹے آتش دیدہ کی طرح کیس سے علیحدہ ہو جاتی۔ انسپکٹر کے لئے زیادہ پریشانی کی بات یہ تھی کہ گورنر خود کیس میں دلچسپی لے رہے تھے۔ یہ انہی کے دباؤ کا اثر تھا کہ صوبے بھر کی پولیس شکاری کتوں کی طرح مصروفِ جستجو تھی۔ وہ کونسا طریقہ تھا جو آزمایا نہ گیا ہو، وہ کونسا حربہ تھا جو بروئے کار نہ لایا گیا ہو۔ مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔

ابھی انسپکٹر اپنی سوچوں میں گم تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ گورنر صاحب بول رہے تھے۔

"کوئی بات بنی اسلم میاں؟"

"نن۔ نہیں جناب! ابھی تک تو کچھ بھی معلوم نہیں ہوا۔ یوں تو ہم پوری سرگرمی سے مصروفِ عمل ہیں ——"

"ابھی کہاں تک پہنچے ہو؟"

"جہاں سے چلے تھے جناب ..... کیا کریں کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ ویسے سرحدی علاقے کی چھان بین کے لئے وہاں کی پولیس کو مطلع کر دیا گیا ہے۔"

"اچھا خدا حافظ"

"خدا حافظ"

رسیور کو تپائی پر رکھ کر انسپکٹر نے گردن کرسی کی پشت پر ٹیک دی۔ آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں۔

"اسلم صاحب! میں قاتل ہوں۔ میں نے اپنی بیوی کو قتل کیا ہے۔ میں قاتل ہوں۔"

انسپکٹر نے یوں بڑبڑا کر آنکھیں کھولیں جیسے کسی بھیانک خواب سے بیدار ہوا ہو۔ تصور ندیم سامنے کھڑا تھا۔ بے یقینی سے آنکھیں ملتا ہوا بولا۔ "بیٹھئے تصور صاحب!"

"نہیں نہیں مَیں قاتل ہوں، مَیں مجرم ہوں۔ ایک مجرم کرسی پر نہیں بیٹھ سکتا۔" تصور زمین پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"تصور صاحب اُٹھیے، آپ کے ذہن پر بیگم کی جُدائی کا اثر ہو گیا ہے۔ مَیں ابھی کافی منگواتا ہوں، پی لیجیے۔ ذہن کو سکون مل جائے گا۔"

"مَیں ٹھیک ہوں، بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے کوئی مرض نہیں ہے۔ I have muldered my wife. I am Katal," تصور نے ہذیانی انداز میں کہا۔

"اچھا چلیے سُنائیے آپ نے اپنی بیوی کو کیسے قتل کیا؟" انسپکٹر نے سوچا شاید غبار آلودہ ذہن یوں ٹھیک ہو جائے۔

"پچھلے دنوں لندن میں تصاویر کی نمائش ہوئی" تصور نے وہیں زمین پر بیٹھے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "مَیں بھی اس مقابلے میں شرکت کے لئے تصویر بنانے لگا۔ ایک دن جبکہ تصویر تکمیل کے آخری مراحل میں تھی مَیں اپنے سٹوڈیو میں کام کر رہا تھا وہ بھی میرے پاس ہی بیٹھی ہوئی تھی کہ اچانک چھت سے ایک چھپکلی اس کے قریب گری۔ وہ خوف سے اچھلی تو میرے ساتھ ٹکرائی اور برش میرے ہاتھ سے چھوٹ کر تصویر پر سیاہ داغ بناتا ہوا زمین پر جا گرا۔ اپنی اتنی محنت سے بنائی ہوئی تصویر کا یہ حشر دیکھ کر مجھ پر غصّے کی کیفیت طاری ہو گئی۔ مَیں نے اپنی بیوی پر لاتوں، گھونسوں اور تھپڑوں کی بارش برسا دی۔ جب اس پر بھی تسلی نہ ہوئی تو مَیں نے اُسے زمین پر گرا دیا اور اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا۔ اور پھر جب مجھے ہوش آیا تو مَیں اپنی ایک ادنیٰ سی تصویر کے بدلے قدرت کا ایک عظیم شاہکار تباہ کر چکا تھا۔ اس کے بعد جوں توں کر کے مَیں نے تصویر مکمل کی اور بھیج دی۔ آج ہی مجھے انتظامیہ کا خط ملا کہ میری تصویر کو پہلا انعام دیا گیا اور اس دھبّے کو خاص طور پر سراہا گیا۔"

یہ کہتے کہتے ندیم کی ہچکی بندھ گئی۔

ملک کا ایک مقبول اداکار اپنی بیکاری اور مفلسی کی وجہ سے ایک تیسرے درجے کے ہوٹل میں کھانا کھانے چلا گیا ——— اُس نے دیکھا کہ ہوٹل کے بیروں میں اُس کا ایک ساتھی اداکار بھی شامل ہے۔

"اخاہ! تم اِس ہوٹل میں بیرے کا کام کر رہے ہو؟"

"تم! بھئی حد ہو گئی" وہ تعجب سے بولا۔

"ہاں مگر مَیں اِس ذلیل ہوٹل میں کھانا نہیں کھاتا" بیرے نے تن کر جواب دیا ———

(عبدالرحیم طلاق سال اوّل (علوم)

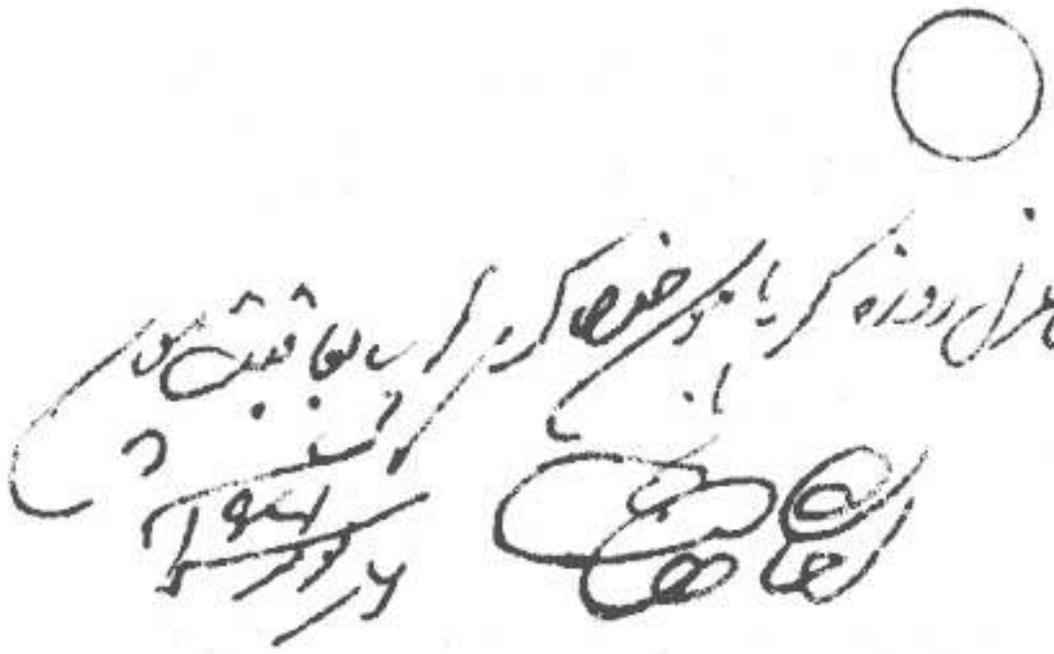

اُٹھ کے اُن کی بزم سے دانش جو گھر آتا ہوں مَیں
ہر نفس میں اُن کی خوشبو کی لپٹ پاتا ہوں مَیں

جانے کیا عالم ہے کس رَو میں بہا جاتا ہوں مَیں
اُن کے ہر منشاء کو اپنا مُدّعا پاتا ہوں مَیں

پتّی پتّی محوِ سرگوشی ہے، آپس میں سہی،
ذرّے ذرّے میں تبسّم کی ادا پاتا ہوں مَیں

جانے کس شہرِ فسوں آگیں میں لے آیا جنوں
جتنا رستہ پوچھتا ہوں گم ہُوا جاتا ہوں مَیں

خوفِ رسوائی سے جو گلیاں تھیں اُن کا انتخاب،
اب اُنھیں گلیوں میں تنہا ٹھوکریں کھاتا ہوں مَیں

کھینچتی ہے شام جب سورج کے سینے سے لہو،
خود کو اِک نیلے دھوئیں کے سائے میں پاتا ہوں مَیں

اِس مشینی شہر میں درکار ہیں پتّھر کے جسم
کارخانوں کے دھوئیں میں حل ہُوا جاتا ہوں مَیں

میری نظروں میں شہنشاہوں کی دہلیزیں نہیں
ایک ہی آقا کے در پر ہاتھ پھیلاتا ہوں مَیں

گاہے گاہے اُس کی رحمت پر جو کرتا ہوں نظر
شرمِ عصیاں سے پسینے میں نہا جاتا ہوں مَیں

باوجود اِس کے کہ اُن سے روشناسی بھی نہیں،
ذکر جب چھڑتا ہے اُن کا سامنے آتا ہوں مَیں

روک دے جو بڑھ کے اقرارِ خدا کے راستے
توبہ توبہ اُس خود آگاہی سے گھبراتا ہوں مَیں
زندگی نکلی تھی جانے کس گھڑی بہرِ سفر؟
کوئی بھی رستہ چلوں سُوئے عدم جاتا ہوں مَیں

اِک زمانے سے اِسی پستی میں ہوں خوار و زبوں،
اِک تماشا ہے، ابھی تک غیر کہلاتا ہوں مَیں
جب ستارے اوڑھنے لگتے ہیں مخواب سحر،
رُوح میں اِک چاندنی کی سی دھنک پاتا ہوں مَیں

مَیں نشیبوں سے چلا ہوں لے کے محنت کا نشاں!
ہر بلندی پر اسی پرچم کو لہراتا ہوں مَیں
جو سفر طے کر چکے ہیں اے صبا کہنا اُنھیں
چند دن کی بات ہی کیا ہے ابھی آتا ہوں مَیں!!

ڈر رہا ہوں خودکشی کر لے نہ ذوقِ جستجو،
منزلیں ہی منزلیں ہیں جس طرف جاتا ہوں مَیں
سیکڑوں رنگوں کی قوسیں گھیر لیتی ہیں مجھے
اُن کے پیکر کو تصوّر میں جو لے آتا ہوں مَیں

مختلف خونیں تصادم دہر تک چلتے ہیں ساتھ
جب سڑک پر آئینے ٹوٹے ہوئے پاتا ہوں مَیں
میرے گنبد میں نہ پہلے تھا نہ اب کچھ ہے مگر
ہر صدا کو سَو اِضافے کر کے لوٹاتا ہوں مَیں

اب ہے راتوں کو تصوّر میں اُنھیں کا آستاں
اِک فصیلِ نور تک آتا ہوں مَیں جاتا ہوں مَیں
سامنے دُنیا کے ہیں دانش مرے فکر و عمل
اپنی چادر کے مطابق پاؤں پھیلاتا ہوں مَیں

○

احسان دانش

تعیم الاسلام کالج یونین
کی افتتاحی تقریب کے
موقع پر جناب ڈاکٹر
اسرار الحق وائس چانسلر
زرعی یونیورسٹی لائلپور
طلبہ سے خطاب فرما رہے
ہیں۔ اور جناب بشیر طارق
صدر یونین کرسی صدارت
پر رونق افروز ہیں

کالج یونین اور ہوسٹل کی
جانب سے جناب اے - سی
صاحب چنیوٹ کو فوجی
محاذ پر [illegible] کے لئے [illegible] کے
یکصد پارسل دئیے گئے -

جناب محمد علی چوہدری ایم - اے (پرنسپل)
فضل عمر ہوسٹل کی سالانہ ان ڈور گیمز کے افتتاح
کے موقع پر خطاب فرما رہے ہیں -

بشیر طارق

صدر یونین

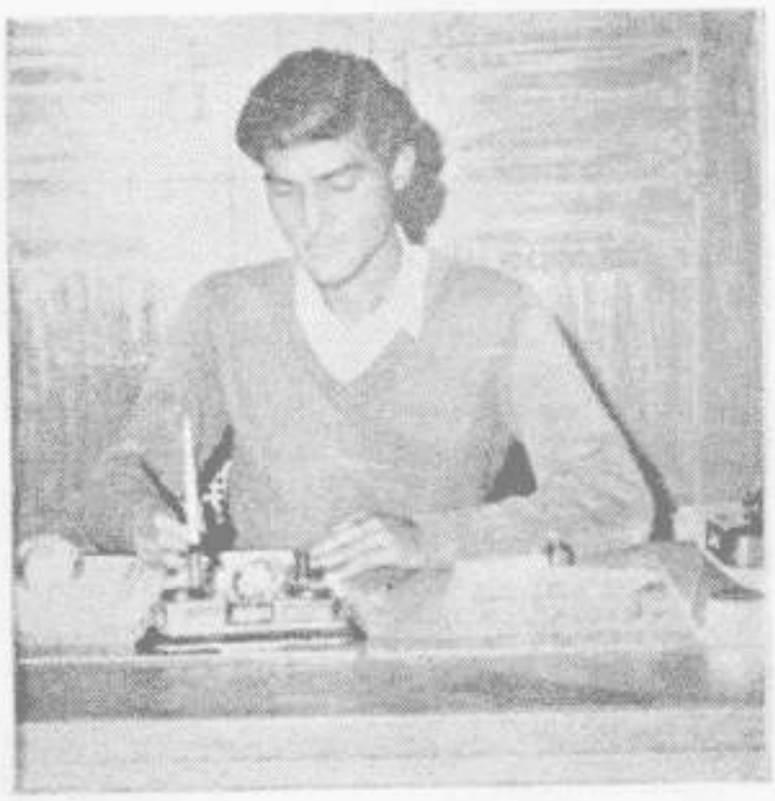

عبدالکریم خالد

مدیر اعلی المنار

تعلیم الاسلام کالج یونین نے فوجی بھائیوں کے لئے تحائف اکھٹے کئے
اراکین یونین پرنسپل جناب پروفیسر محمد علی چوھدری کے ھمراہ

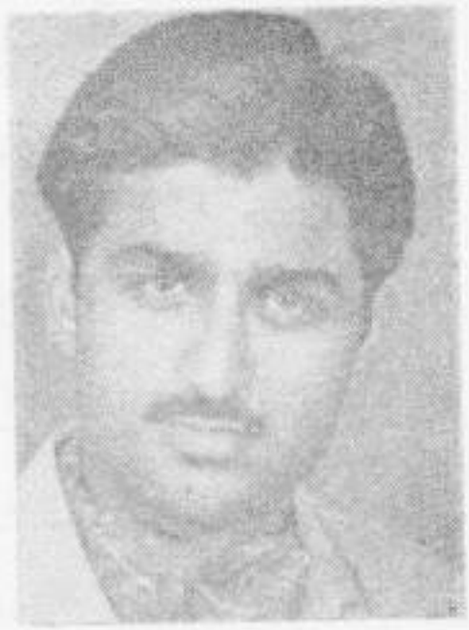

احمد ریاض تھابل

سیکرٹری کامن روم

ضیاءالرحمن امجد

صدر ھوسٹل فورم

عابد ریاض ملک

چیف پریفیکٹ ھوسٹل

جناب سجاد باقر رضوی

○

شعلہ سا کوئی برقِ نظر سے نہیں اُٹھتا
اب کوئی دھواں دل کے نگر سے نہیں اُٹھتا

وہ رونقِ کاشانۂ دل بجھ سی گئی ہے
اب شور کوئی اِس بھرے گھر سے نہیں اُٹھتا

لبّیک کہے ناقۂ لیلےٰ کو بھلا کون ؟
اب قیس کوئی گردِ سفر سے نہیں اُٹھتا

تبدیل ہوئی آب و ہوا شہرِ وفا کی
اب درد کا طوفان اِدھر سے نہیں اُٹھتا

یوں راہِ طلب دیتی ہے آواز ہمیں بھی
اب پاؤں کسی بات کے ڈر سے نہیں اُٹھتا

دیوانے کو نیند آگئی تاریکیٔ شب میں
سویا ہے تو اب خوفِ سحر سے نہیں اُٹھتا

یارو اسے دیکھو کہیں باقرؔ تو نہیں
پہروں جو کسی راہگزر سے نہیں اُٹھتا

ثاقب زیدی

عزمِ نو

قدم قدم پہ بڑی کلفتوں سے اُلجھے ہیں
رہِ حیات میں ہم پتھروں سے اُلجھے ہیں

تیرے دیار میں اکثر اے قائدِ اعظم
ہم حُسنِ وفا کے صلوں سے اُلجھے ہیں

لباسِ گُل پہ بھی دیکھی خراش کانٹوں کی
چمن میں رہ کے بھی ہم نکہتوں سے اُلجھے ہیں

نہ حادثات سے تھے نہ ہم حادثوں کے بانی تھے
کس خطا پہ نئے حادثوں سے اُلجھے ہیں

ترے وطن کو بنائیں گے ہم تیرا مقصود
طویل عمر انہی ولولوں سے اُلجھے ہیں

شعورِ جادہ سے خالی نہیں ہیں اہلِ سفر
سفر پسند کئی منزلوں سے اُلجھے ہیں

ہمارے ساتھ ہے تائیدِ ایزدی ثاقب
اسی بھروسے پہ ہم دشمنوں سے اُلجھے ہیں

پروفیسر ڈاکٹر پرویز پروازی
(صدر شعبۂ اُردو۔)

جو شمع ہم نے جلائی جلا سکا نہ کوئی

خدا کا نور ہیں ہم کو بجھا سکا نہ کوئی
وہ نقش ہیں جسے اب تک مٹا سکا نہ کوئی

اُٹھے تھے قیصر و کسریٰ ہمیں مٹانے کو
مٹے خود ایسے کہ اُن کو بچا سکا نہ کوئی

رُکیں تو کوہِ گراں ہیں، بڑھیں تو سیلِ رواں
ہماری راہ میں اب تک تو آسکا نہ کوئی

دیا ہے ہم نے زمانے کو نُورِ بطحا کا
جو شمع ہم نے جلائی جلا سکا نہ کوئی

ہمارے دل میں محمدؐ، نگاہ میں اللہ
سوائے اُن کے نظر میں سما سکا نہ کوئی

یہ قوم موت کی آغوش میں پنپتی ہے
نڈر وہ ہے اِسے اب تک ڈرا سکا نہ کوئی

لبوں پہ نَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه
سبق جو ہم نے سُنایا سُنا سکا نہ کوئی

خدا، خدا ہے وہ قادر بھی ہے توانا بھی
جو اُس کے ہو گئے اُن کو جھکا سکا نہ کوئی

شبّیر شاہد

معرضِ اظہار

تمہیں ناز ہے آئینوں پر
تو آؤ
ذرا اس سمندر کی گہرائیاں منعکس کر کے دیکھو
ہمیں وہ دکھاؤ
کہ جو منظروں میں نہیں، اور موجود بھی ہے

تمہاری طلب دائروں کی حقیقت سے واقف نہیں
کبھی اپنی چادر سے باہر بھی پاؤں پسارو
تو تم پر کھُلیں

وہ جہانِ معانی، وہ پہنائیاں اور وہ دائرے
کہ یہ شش جہت جن میں نقطوں کی صورت ہیں گرداں

مگر تم کو فرصت کہاں آئینہ سازیوں سے
کہ تم اپنے لفظوں کی پرکار سے ہر خلاء ناپتے ہو!

خالد آفاقی

ڈھونڈنے نکلے تو تھے شہروں میں ویرانوں میں بھی
کیسے ملتا جو نہ تھا گزرے ہوئے لمحوں میں بھی

ہاں! خریداری کا ہے کس کو سلیقہ اِن دنوں
بیچنے والے بہت بیٹھے ہیں بازاروں میں بھی

جس کی خاطر سینکڑوں اوراقِ گُل نوچے گئے
پڑھ لیا وہ راز مَیں نے زرد رُو پتّوں میں بھی

صرف مجھ پر کیوں تری چاہت کا الزام آئے گا
پیار کا انداز تھا جب کہ تری باتوں میں بھی

گر گئی ہیں میری بوسیدہ چھتیں خالدؔ تو کیا؟
زلزلہ آیا ہے اُس کے گھر کی دیواروں میں بھی

عبدالرشید شاہد
(اولڈ بوائے)

ہمّت کا شناور

کیا غم ہے جو طوفاں کے بھنور میں ہے سفینہ
آتا ہے توکّل پہ خدا کے ہمیں جینا

اس ملک کی افواج کا ہر فرد جری ہے
ہمّت کا شناور تو صداقت کا نگینہ

یہ ملک ہے اسلام کی عظمت کا نگہبان
ایمان کی دولت کا سراسر ہے خزینہ

خوش رنگ گلستاں میں نظر آتی ہے جو شبنم
ملّت کے جوانوں کا ہے خون اور پسینہ

غیروں کے سہارے سے بھرم ہند کا قائم
لڑنے کا سلیقہ ہے نہ جینے کا قرینہ

شاہد رہو ہوشیار زمانے سے یہ کہہ دو
بے دین، بے ایمان یہ دشمن ہے کمینہ

عاصم صحرائی

غزل

رات بھر لرزاں تھا پلکوں پہ ستارا کس لئے
میری آنکھوں میں اُمڈ آیا تھا دریا کس لئے

شام ہوتے ہی مقفّل ہو گئے تھے سارے لوگ
رات بھر رقصاں رہا گلیوں میں سایہ کس لئے

جس کو میری بات کا ہر لفظ کھٹکا تھا کبھی
میری باتوں پہ یقیں اب اس کو آیا کس لئے

میں تو اک مدت سے اپنی ذات میں روپوش تھا
ڈھونڈنے والو، بتاؤ، تم نے ڈھونڈا کس لئے

جھرجھری سی اک بدن میں آ گئی یہ سوچ کر
اپنا کتبہ اپنے ہاتھوں میں نے لکھا کس لئے

وہ جو اوروں کا تماشا دیکھنے نکلے تھے آج
بن گئے اپنی نظر میں خود تماشا کس لئے

جس نے عاصم اپنے گھر سے کل نکالا تھا مجھے
آج آخر میرے گھر میں خود وہ آیا کس لئے

پارہ ہائے جگر!

(ذیل کا کالم مبتدی شعراء کی حوصلہ افزائی کے لئے شروع کیا جارہا ہے ـــــ مدیر اعلیٰ)

عنواں نے جسے ٹھکرایا ہے وہ درد بھرا افسانہ ہوں
جو شمع سسکتی رہتی ہے اُس شمع کا پروانہ ہوں

ساقی کی عنایت عام سہی مخمور ہیں پینے والے بھی
جو گریاں ہے وہ شیشہ ہوں جو ٹوٹ گیا پیمانہ ہوں

اِس دُنیا کے دوراہے پر مجبور بھی ہوں بے چین بھی ہوں
غیروں نے حقارت سے دیکھا، اپنوں کے لئے بیگانہ ہوں

(لئیق احمد عابد سال چہارم)

حیرت سے مجھے تکتی ہوئی گلیاں ہیں سنسان
تپتے ہوئے اِس شہر کا ہر گوشہ ہے ویران

سناٹا ہے چھایا ہوا گھمبیر فضا میں
یہ راہ میں بکھرے ہوئے پتھر ہیں کہ انسان

یہ کون دریچہ سے ابھی جھانک گیا ہے
اِک سمت کھڑا سوچ رہا ہوں میں پریشان

اِس شہرِ خموشاں میں کہاں جاؤں اکیلا
راہبر بھی کوئی ساتھ نہیں لوگ بھی انجان

(جلیل الرحمٰن سال دوم، علوم)

بھول صحرا میں بھی آمد سے کھلا دیتے ہیں آپ
اور گلشن کو بھی ویرانہ بنا دیتے ہیں آپ
ہم تو دیکھا چاہتے ہیں آپ کا حُسنِ بیاں
بات کچھ تو کیجئے کیوں سر جُھکا لیتے ہیں آپ

(انوار احمد سال دوم، فنون)

کس کو بتلائیں کہ اِس درد میں کیا رکھا ہے
ایک شعلہ ہے جو سینے میں چھپا رکھا ہے
میرے افکار پہ پہرہ ہے زمانے کا ہنوز
میری آواز کو دُنیا نے دبا رکھا ہے
اپنے احوال کا اظہار ہے مقصود نصیر
ورنہ الفاظ کی تکرار میں کیا رکھا ہے

(نصیر احمد سال دوم علوم)

آہ! کیا گزری چمن پر سر بسر جاتا رہا
آشیاں باندھا تھا جس پر وہ شجر جاتا رہا
رائیگاں نالے گئے اور نارسا آہیں رہیں
نور تھا جو زندگی میں وہ قمر جاتا رہا

(ادریس قمر سال اوّل، علوم)

بقلم الاستاذ محمد عثمان الصديقى

تفسير آية من القرآن

(ألبحث فى النسخ)

ما ننسخ من آيــة أو ننسها نـأت بخير منهـا أو مثلها ألم تعلم أن الله على كل شيئ قدير .

(مــا) مهمــا أو أيمــا (ننسخ) نبــدل أو نعطل الحكم (من آيــة)

أى حكم من الأحكام أو شريعـة من الشرائع المراد بالنسح نسخ الشرائع قبل القرآن فالله نسخها لأنها كانت مختصة بالأقوام والازمان فــأ فادت ما أفادت فى أزمنتها ثم تعطلت جزءاً أو كلا بمقتضى الحال فوقعت الحاجــة إلى أحكام أفضل و أجمع مما فى الكتب السابقة فلهذا نسخت تلك الشرائع بالقرآن والنسخ هو إزالة حكم سابق بحكم لا حق والأول منسوخ والثانى نـاسخ و ينسخ لمصلحة فكيفما كانت الضرورة والمصلحة كان الحكم كذلك ، فليتضح ذاك الأمر أنه ليس المراد به النسخ فى آيات القرآن كما سبق لأن القرآن كله و آياتــه حتى كلماته والفاظه وحروفه محفوظــة مصونة من النسخ والتبديل فمن أراد بــه النسخ فى القرآن فقد جــاء بغلط فاحش ، كيف والقرآن يرد النسخ فيـه ردا صريحاً قال الله تعالى فى شأنه ''إنا نحن نزلنا الذكر و إنا له لحافظون،، ثم قال و انه كتاب عزيز لا يأتيه الباطل من بين يديه ولا من خلفه وأيضاً قال ''فى صحف مكرمة مرفوعة مطهرة بأيدى سفرة كرام برررة،، وهناك آيات اخرى فى رد النسخ فى القرآن فأنى يمكن النسخ فى الفرقان المبين المهيمن على ما قبله من الصحائف ـ

وإنما أريد به النسخ فى القرآن غلطاً لأنه ورد فيه بعض آياته التى لا تطابق بين اثنتين منها ظاهراً و أما باطناً فبينهما التطابق تــاماً ولعدم امعان النظر والتفكر العميق فى معانى الآيات المتشابهة قالوا بالنسخ فيها والعياذ بالله ـ

ثم نرجع إلى مقصدنــا و نقول إنه نسخ لكل شريعة أو كتاب قبل القرآن كالتوراة والإنجيل و قد أشير فى القرآن إلى الخيانــة فيهما على أيدى تــابعيهما فلما حرفوهمــا أنفسهم و نبذوهمــا وراء ظهورهم وجعلوهما كالمنسوخ والمنسى فــالله

نسخهما رأساً و أزال حكمهما و عوض بهما القرآن الناسخ لهما فهذا هو مفهوم الآية (أو ننسها) أى الآية نمحوها من أذهان الناس و أسند الفعل إلى الله تعالى لأنه العلة الفاعلة فى كل شئ وإنما أهل الكتاب نسوا الآيات والأحكام و وقع الانساء بتحريف العلماء فى الكتابين و نسوا مـا نسوا لأغراضهم الدنيوية و كتموهـا و لبسوا الحق بـالباطل و هكـذا إشتبه الوحى بكلام الناس ، (نأت بخير منها) هذا فى صورة النسخ فانظر إلى القرآن بالنسبـة إلى التوراة والانجيل هو خير و افضل منهما و من كل سفر فى كل أمرو حكم(أو مثلها) و فى صورة الانساء نرى ان الله ، الحكيم قد اتى فىالقرآن ببعض الآيات والأحكام مثل بعض كانت فى الكتابين قبله و كان متبعوهـا نسوهـا لأجل أمانيهم فأتى فى القرآن بخير منهما و فى بعض الأحكام بمثلها معاً و هكذا أوتوا الكتابين من جديد فى صورة القرآن أحسن و أمثل منهمـا و بنسخ القرآن التوراة و الانجيل كسر الله زعم أهل الكتاب و هو كمـا قالوا إن لديهم التوراة و الانجيل فيهما حكم الله فكيف يدعونهما و يتبعون القرآن كما يدعون إليه ففى الآيـة جواب لهم أن الكتـابين كانا هـدى لاهل الكتـاب دون من سواهم فى عهـدهم وعصرهم لا إلى يوم القيامـة ولما انقضى عهد الكتـابين جاء الله بالكتـاب الموعود المصدق لما بين يديـه وهو أفضل من كتـابيهم فهذا هوالسبب الموجب أن يؤمنو بـه ويتركوا ما دونـه (ألم تعلم) أيها الفطن اللبيب (أن الله على كل شئى قدير) وفعال لمـا يريد بحكمته و السر فى استعماله صفة قدير ألدلالة على أن نسخ الاحكام و الشرائع عـلىالله يسير فهو الشـارع المقنن يرى مصالح قـوم فيـؤتيهم حكماً ثـم يرى مصلحـة اخرى فيبـدل الحكم الأول فلوأنه آتى بقـدرتـه و مشيئتـه أهل الكتـاب شريعـة جرت لهم احقـاباً فهو يقـدر على أن ينسخـه إذا القوم أنفسهم قدحرفوه و بدلوه و أضافوا فيـه غيره و أخرجو منه أصلـه فافهم و تدبره ونعم ما قيل فى فضيلـة القرآن :

فيـــه الفضائل كلها قـــد حاز
و النسخ فى القرآن ما قد جاز
لا ريب فيه هو الصراط سويا
من تبعـــه بيقينه قـــد فـــاز

ايوب اقبال احمد
الدرجة الثالثة (فنون)

الانسان و الكون

اذا نظر احد الى هذا الكون تفكر و سئل عنه مـــا هو ؟ لماذا و لمن كان خلق ؟ الشمس والقمر والريح والنجوم والبهائم لماذا جعلوا ؟ وايضا يسئل احدنـــا ما الانسان ؟ و لما ذا خلق ؟ و مـــا اهميته فى الكون و ما مكانـــه ؟ من هو خالق الكون والانسان .

فجواب هذه الاسئلة أن هذا الكون مجموع من الخلائق العديدة الكثيرة و يدل الكون على الخالق و يقتضيـــه لأنـــه لا فعل بدون الفاعل ولا مخلوق بغير الخالق فخالق هذا الكون و الخلائق من هو ؟ نحن المسلمون نؤمن . . . . ان الله خالقه و مبدعه و مكونه ـ ان الله خالق و مالك هذا الكون و إله العوالم جميعها .

و متى ينظر الأنسان الى الكون و يتفكر فى خلقـــه يعلم ان خالق الكون موجود فى ذاتـــه كما قـــال الله فى القرآن ''ان فى خلق السموات والارض واختلاف اليل والنهار لآيات لاولى الباب،، ـ ان هذا الكون يهدى الى الخالق الذى هو خالق و مالك و اله كل الخلائق ـ

الانسان مخلوق ايضاً لكن الانسان اشرف الخلائق كما قيل فى نبينا محمدن المصطفى والمرتضى صلوات الله و سلامه عليه ''لولاك لما خلقت الافلاك،، اى كل شيئ تنظر اليـــه كان خلق لمحمد صلى الله عليه وسلم و كان محمد بشراً فلذالك كان الورى خلقت للانسان لخدمتـــه كما نصه القرآن ''سخرلكم ما فى السموات والارض،، ان الله قد سخر القمر والسماء والنجوم والريـــاح والبهائم والمياه للانسان والانسان يستخدمها و يستفيد بها .

غاية خلق الانسان العبادة والطاعة كما يقول الله فى القرآن ''و ما خلقت

الجن و الانس الاليعبـــدون ،، ان الله خالق الورى و رب الخلائق و خلق الانسان باحسن خلق و شرفه و فضله على كل مخلوق سواه ـ و يسرله متاعاً لحياته ظاهراً و باطناً ان الارض تنبت القثاء و البقل والعدس والفوم و الاثمار جعلها الله لبقاء جسم الانسان و يقـول الله انـــه ينزل المـــاء و يخرج الرزق للانســـان كمـا قـال ''و انـزل من السماء ماء فاخرج به من الثمرات رزقاً لكم،، (القرآن) .

و لحياة روحه يرسل الله المرسلين بهداية و شريعة ـ و اذا الظلمة والضلالة تنتشر فى الارض يرسل الله الانبياء باالنور كان الرسل يرسلون فى زمن قديم إلى قوم خاص و كانت شريعتهم لذالك القوم ولذالك الزمن خاصة و اذا أتقن عقل الانسان فى كماله ارسل الله شريعة كاملة للعالمين كما قال ''اليوم اكملت لكم دينكم واتممت عليكم نعمتى،، (القرآن المجيد) .

و انزل الشريعة على نبى كامل اى على محمد صلى الله عليه وسلم الذى هو رحمة للعالمين و بعث الى كل قوم و امة الى يوم القيمة كما قال الله ''و ما ارسلنك الا رحمة للعالمين،، . (القرآن)

رسولنا كامل و شريعته كاملة و هذه الشريعـــة اى القرآن يهدى الناس الى الخـــالق و يقربهم الى ربهم و لا يزال ينور قلوبهم بنور السمـــاء الى يوم القيمـــة ''ان هذا القرآن يهدى للتى هى اقوم،، (القرآن)

ان الانسان يعيش فى الدنيا كالغريب ـ ان الدنيا مزرعة الاخرة ان الحياة حقيقة فهى حياة الآخرة ما تعمل من عمل فى الدنيـــا نجده مكتوبـــاً عند ربنا يوم القيمة من آمن بالله وعمل عملا صالحا فقد فاذا فوزاً عظيماً كما قال الله ''وبشر الذين آمنوا و عملوا الصحت ان لهم جنت تجرى من تحتها الانهر،، (القرآن) ومن كفرفقد خسر الدنيا والآخرة ''والذين كفروا و كذبوا بايتنا اولئك اصحب النار هم فيها خلدون (القرآن) .

ان العبادة لازمة لحياة الروح والعبادة طاعة الخالق فى كل امر ـ العبادة على قسمين ـ حقوق الله و حقوق العباد و ارجو سأكتب فى ذالك عن قريب انشاء الله و بالله توفيقى .

رئيس التحرير : عبدالكريم خاله ـ طابع وناشر : جنيدهاشمى ـ طبع بمطبعة النصرة بربوة باكستان

AL-MANAR

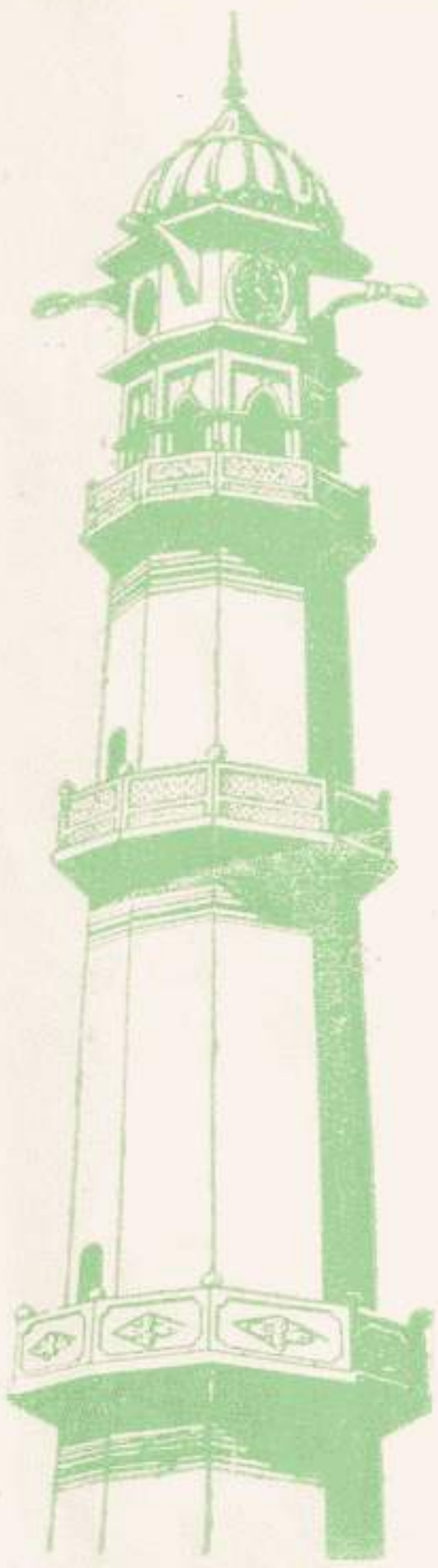

Talim-ul-Islam College
Rabwah

Oct., 1971 to June 1972

AL-MANAR

Talim-ul-Islam College, Rabwah

OCT., 1971 TO JUNE 1971

Patron :
Professor Mohammad Ali Chaudhry M.A.

Professor-in-Charge :
Mirza Khurshid Ahmad M.A.

Editor-in-Chief :
A. H. Abdool Rahman

Editor :
Syed Jalil Ahmad

NUSRAT ART PRESS RABWAH

CONTENTS

1. From the Editor Desk ... 1

2. The Impact of Sports ... 4

3. Propaganda ... 5
Khalid Ahmad Ata F.Sc. II

4. Introducing Mauritius ... 8
M. Khedaran F.Sc. I

5. To My Love ... 14
Ahmad Riaz Thabal B.A. I

6. Our Duties Today ... 15
S. J. B.Sc. I

7. Tahdith-i-Nimat—A Review ... 17
Professor Qazi Mohammad Aslam

8. To the Past : Quo Vadis ... 22
Waseem Ahmad Khan (Old Boy)

9. Law, Society and the Individual ... 24
Ch. Muhammad Zafrullah Khan

10. Miracles or What ? ... 34
Khawaja Atta-ur-Rahman F.Sc. II

11. The impression of most Pakistani Youth about Africa and the Africans ... 36
M. S. Gassama B. Sc. I

Printed at the Nusrat Art Press, Rabwah, and published by A.R. Junaid Hashmi for T.I. College, Rabwah, Pakistan.

Habibulla Tariq

First Prize from Islamia College Narowal

First Prize from Muncipal College Sanglahill

Third Prize from Guru Nanak Memorial College Nankana Sahib.

English Debate

Trophy from Muray College Sialkot.

Second Prize : M. Sarwar Shah.

Consolation Prize : Atteeq Ahmad.

Mushaira

Trophy from Muncipal Degree College Bhalwal.

First Prize : Abdul Karim Khalid

Third Prize : Laeeq Ahmad Abid

Individual Prizes in Mushaara

Abdul Karim Khalid

Third from Govt. Degree College Jehlum.

Jaleelureman Jamil.

Second Prize from Govt. College, Lyallpur.

Laeeq Ahmad Abid

Third Prize from Muncipal College Shahkot

Third Prize from Islamia College Lyallpur

Individual Prizes in Punjabi Debate

Laeeq Ahmad Abid

First Prize from Govt. College Tala Gung.

Third prize from Muncipal College Gojra.

Consolation prize from Govt College Lyallpur.

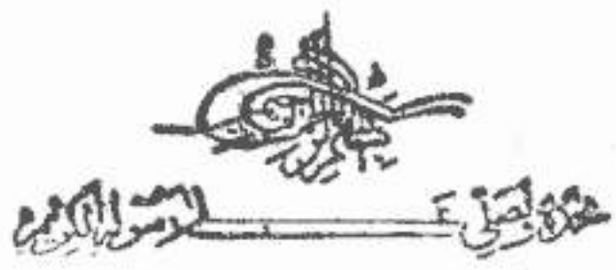

AL-MANAR

TALIM-UL-ISLAM COLLEGE, RABWAH,

MAGAZINE

Vol. VII	OCT., 1971 TO JUNE 1972	No. 2

From,

Editor's Desk

Open any newspaper these days and what are the items that make the headlines—politics and its concomitant troubles (war, actual and cold, P.O.W. problems, etc.), labor strikes, students' unrest, accidents (the ones more gory and spectacular than the others), crimes of every description, etc., etc,. rarely any good piece of news. The common factor in all these is of course man, and if he is in so much trouble everywhere, I wonder if we could not bring him some relief. How? In our daily workaday life we come into constant contact with him (unless we are of the hermit type!). Well, I believe that if we could show more tolerance, kindness and understanding to him, it would go a long way into combating all the unhappiness and disillusion, frustration and sourness of this world, or at least of the immediate world around us. Possibly three duties are incumbent upon every man. To be thankful to his creator, to take care of himself, and thirdly to be kind and considerate to others. All the rest is only literature.

★

Life is worth living inspite of, or rather I should say because of, all its troubles and hazards and reverses; it's worth living. There are

two main ways of looking at difficulties and 'headaches'. One is to allow them to dampen our spirit, to give in to despondency and despair, and generally to shirk away from facing the facts. This is the way which leads to the grave. The other is to consider difficulties and setbacks as challenges to our spirit, to our god-given faculties, to our individuality and to face them squarely and bravely. This is the way to success. People who resort to the first solution, if solution it can be called, are only *extising* whereas those who choose the second way are *living*. There is no other way to solving problems apart from looking them straight in the face, and applying our keenest attention to them. And remember difficulties which give us headches are only simple problems which are magnified by the halo of fear we have allowed to grow round them. To take an extreme case - if we are in for a hiding, well let's take it now, rather than think about it through sleepless nights and take it afterwards.

And talking about problems, I remember reading an interview which the famed conqueror of Everest, Sir Edmund Hillary, once gave. To the question as to why he had done that feat, his answer was simple, yet one impregnated with the indomitable spirit of Man, with a capital m. His reply was, "Because it was there." That's all ; it was there and he took it as a personal challenge, and he conquered it. That reminds me of a saying of the Tamil poet Tirouvaluvar, (if I remember right) : "It is a challenge to thee to make thyself what thou knowest thou cans't be."

So that's it. Life is a challenge. Take it up as a man and give in your very best. Nothing is impossible ; wipe that word off your dictionary and that scowl off your face. At worst things might be very hard and very bad, but nothing, or then very few things, are really impossible in this everyday world of ours. After all, a life of unbroken ease would be monotonous like hell and would quickly bore us to death.

Troubles and reverses and difficulties are the spice of life.
Life is worth living. Hurrah for those who pick up the gauntlet !

———★———

This issue, long overdue and the last one under my editorship, does not contain much in the way of original and stimulating reading. This is due largely to my own limitations for the post I was mistakenly

given. I would, however, wish that next session sees more contributors to this section coming forward. The Urdu section has always been oversupplied with material, whereas this section has likewise always had to battle for survival.

Something else that will be noticed is that some of the articles in this issue taste of staleness. This is somewhat inevitable when events move so fast and when the gathering of viable material takes so long. It is moreover actually difficult for a publication of this kind to hope for topicality. What would help in this respect, and this is my considered opinion, is some sort of weekly or bi-monthly gazette, of the kind already so successful in certain other institutions. Such a publication would offer many advantages. Apart from providing a medium for discussing national and international affairs of the day, it would also be a forum for discussing college news, and students' needs, for reporting campus happenings, etc. Moreover announcements and postings, from the direction of the college could also find a place in it. As far as the financial side is concerned, it need worry no one. The manuscript could be stencilled and cyclostyled, which would cut the cost to a practical one.

Of course this is only a suggestion, albeit a strong one. The final decision rests with the concerned authorities.

A. H. Abdool Rahman

What's the use of worrying?
It never was worthwhile,
So pack up your troubles in your old kit-bag,
And smile, smile, smile.

George Asaf

THE IMPACT OF SPORTS

(A Retrospection)

On the eve of my life (I call it 'eve' because I am nearing the destined end of the calculated span of three scores and ten) while I ponder over what made me the being I am, certain events strike me as significantly prominent. I recognize their influence on my life and feel pleasure in recalling and recounting them. I am sure, Mr. Editor, their presentation to you and your readers will not be without interest.

Man, it is said, is the architect of his own fate. This fate, I believe, is not something imposed on man, but the result of his own doings and the outcome of his omissions and commissions. It is man's reaction to the incidents of his life, his handling of situations and response to opportunities, that make his fate. But to me it seems that I was born for a definite career. My preparation for this career started early in my life without any consciousness on my part, till gradually I acquired the requisite qualifications for it. My aptitude for games, particularly for cricket, has always been a source of strength to me. I had opportunities in life when I could demonstrate this aptitude. Having found fullest manifestation it left an impact on my life which can hardly be exaggerated. But I shall have to be explicit, Mr. Editor.

I am speaking of my aptitude for games and cricket-mindedness. Simultaneously with this spirit, if not earlier, appeared my interest in religion that was to restrain my vagaries in the domain of sports and to mould my life in a particular direction. Here I am reminded of an incident in my life that may testify to my observance of the tenets of Islam even in my early youthful days. It was summer, rather a cruel summer and we were playing a full-day cricket match when I was fasting. This impressed my muslim teachers at least, to such an extent that they were never to forget my devotion to religion. Years after I had left the portals of my college when I met Prof. Ikram Ullah, our cricket incharge in those days, I asked him if he could recognize me. "How could I forget a true Muslim like you, who I remember, played cricket keeping. fast

in spite of the most trying weather" was his reply. My interest in religion enabled me to acquire sufficient knowledge of theology while I was still in my teens. Among the books that I found most illuminating in the beginning was the Ahmadiyya Pocket-book' compiled by Malik Abdur-Rahman Khadim (of blessed memory). As it turned out and I am talking of 1928-29, when most of your readers, Mr. Editor, were not yet born, late Khadim Sahib, was still a first year student, incredulously for me, of course, who, in view of his learned articles and speeches had taken him for an elderly and venerable oriental scholar. To cut short, Mr. Editor, Khadim Sahib was a member of the Gujrat College Cricket team which contested our claim to zonal Championship at Jammu. I had the honour of leading my college XI, with trundler-like Nisar, (S.M. Nisar, recognized as one of the fastest bowlers of the world, since deceased) among the side. We dismissed the Gujrat College rather cheaply but Agha Raza (C.S.P., now retired) pulled his side out of the tight corner they were in, and the game ostensibly tilted in their favor. Raza was driving without let or hindrance when all of a sudden one of his fastest straight drives struck my hand to cling to it, as it seemed. Tables were turned and we won the match we might have lost. I remember the details of the contest to this very day and so does Mr. Agha Raza. We had not met each other for about 35 years after this encounter. No wonder then, if Mr. Agha Raza, our Divisional Commissioner, to whom I was introduced by a common friend in 1966-67, could not recognize me, now a grey-bearded headmaster, by appearance. But such is the force of associations in the field of sports that he still remembered vividly the captain of his opponents who had brought their downfall. When reminded that I cherished the game I played against him in 1928 at Jammu, he ejaculated, "It mean you are Mr. Ibrahim". And that I was. This renewal of association brought us closer to each other in later life and Agha Raza never failed to show me tremendous consideration thereafter.

Incidently, the Principal of our Jammu College was equally interested in cricket and had a special regard for my keenness, tact and sportsmanship, as he called it. I was not admittedly a very good student of Economics but he wanted me to avail myself of the state scholarship and do my M.A. at Lahore in that subject to return to the college as lecturer. But that was not to be and it causes me no regret.

I joined the Central Training College at Lahore where I carried my

reputation as a cricketer and continued showing zeal and interest in the game. Principal Parkinson, himself a keen cricketer, would willingly join friendly college contests and members of the staff, Maulvi Abdul Hamid, Sufi Tabassam, Mr. Khosla and several others would vie with another to find places in the team with a view to impressing the Principal with their sporting talents which was deemed to be an extra qualification for promotion. Principal Parkinson, going out of his way, granted me a stipend purely meant for academic achievements on the basis of my contribution to college sports and Maulvi Abdul Hamid, my professor of English, later appointed as Divisional Inspector of schools, sent me an appoinment to join a government school's staff as soon as I passed out, thereby showing his recognition of my talents. But again fate willed otherwise.

As a true Ahmadi who should visit the centre off and on, I prevailed upon Principal Parkinson to send the college team to Qadian for a friendly game. Cricket in Qadian in those days was still in its infancy and that is why they scored a paltry 10 conceding me a fabulous reputation as a bowler. The result of the match brought me to the notice of Hazrat Sahib (Khalifatul Masih II, may Allah be pleased with him) who deputed Hazrat Maulvi Muhammad Din the then Headmaster of T. I. High School (now Sadr, Sadr Anjuman) to fetch me to his school. I shall be reaching a head of my story if I were to go into the details of this mission. Suffice it to say that I was at last on the staff of the school on Dec. 15, 1929.

At Qadian, cricket formed a part of our life during the thirties. Almost every youngman that mattered was a member of the Qadian Cricket Club, Q.C.C, as we called it. That I had at one time a cricket bat in common with the most revered personality of our day, Hazrat Khalifatul Masih III, is more than a matter of pride for me.

At Rabwah our sporting habits and character continued influencing all those who had any concern with sports. Our District Headmasters' Association would often entrust to me the enviable job of umpiring the cricket matches in preference to other available and otherwise qualified umpires. Sometimes even schools pitted against my own school would press me into umpirig, and avoid however much I would, they would not concede. They even installed me as their President for a term or two. Faith apart, ties of sincere friendship and mutual consideration, understanding inspired and prompted them to approach Hazrat Sahib with a view

to obtaining his willingness to grace the farewell party they had planned to arrange on my superannuation in 1969.

In harness or superannuated, I believe, Mr. Editor a sportsman always keeps his association with sports alive. It becomes, as if it were, his second nature. And I am indeed indebted to your worthy Principal, whose personal presence in the sports field is a great acquisition for the college, for providing me the requisite facilities for satisfying my sporting instinct by keeping me on the organizational side of the Divisional Basketball Association to this day. Reviewing subjectively the part played by sports in one's life, Mr. Editor I can say without fear of contradiction that it contributes a lot to making you active, considerate and fair-minded. The impression that sportsmen are never good at studies, is untenable at least in my case. You can at once be a good student and a good sportsman, and if I am allowed to put it, win distinction as allround best student, as I did in my college days.

Muhammad Ibrahim
(Retired Headmaster)

To see a World in a grain of sound,
And a Heaven in a wild flower,
Hold Infinity in the palm of your hand,
And Eternity in an hour.

—*William Blake*

Khalid Ahmad Ata
F.Sc. II

Propaganda

We often come across this term now-a-days whenever we discuss the Indo-Pak crisis. In fact every developed and under-developed country has its own propaganda machinery which actually stands for falsehood. In the last general elections every one of us watched processions shouting their own and most of the leaders making speeches for nothing but to grind their own axe.

In the following lines, I shall tell you what 'propaganda' means and how you can be successful in this field.

Propaganda is the art of making nonsense seem desirable. It is a very old art; people practised it even 2500 years ago. In the past 50 years it has been developed to such an extent that it is very easy to acquire it now.

It does not matter how black is the lie that you want the people to accept as truth you can successfully put it over if you observe a few elementary rules. *Firstly*, tell your lie loudly; *Secondly*, tell it in the simplest language which even the mentally subnormal could grasp. *Thirdly*, tell it again and again, at frequent intervals, without introducing any confusing variations in the formula you use. *Fourthly*, make sure that your propaganda involves hating somebody (it does not matter particularly who, but hate is a pleasurable and a very blinding emotion). *Fifthly*, make sure that you enlist the supporters of your society—pick pockets, sneak-thieves, black-mailers and other notorious people who are too lazy to work and therefore prey on those who do. Such people are very helpful because they hate and are jealous of the intelligent and competent people who are your chief danger.

To achieve quick and good result, make full use of radio-vans. Send them around the town and country-side, each one staffed with a hoarse-voiced announcer shrieking your slogans in an urgent, excited voice. Intelligent people will think it is a running dog-fight and will not even look out of the window, but the mass of the people will be drawn. Use

gramophone records of people shouting slogans in chorus ; have easily remembered words and tunes which are song-like, and the children will pick them up and sing in the streets. Repetition of these songs and slogans at least once every hour will lead to good results.

Organize mass rallies and provide the public with free transport, flags and free refreshments. It is no loss because the people themselves pay in the end, but they will think that they are getting something for nothing and will come along for the ride and refreshments. Make violent emotional speeches ; avoid truth mostly and fill the newspapers with your lies ; do not care whether they are credible or not ; you will gradually build up an atmosphere of belief by repetition. But to do this, you must suppress all opposition. Newspapers and magazines which tell the truth about you, should be banned and regarded as traitors to the people. Individuals who speak against you must be imprisoned (accuse them of corrupt practices or anything else. You will be able to appoint plenty of witnesses from among the parasites who support you). If you fail to imprison them, see that some of your supporters beat them up so severely that they are unable to oppose you any further. It will be excused by the public as an excess of labour in the cause of 'the people'. Always speak in the sacred name of 'the people' Nobody will be able to prove that you do not in fact represent them because the idea that 'the people' have a voice is a myth.

Take a few lessons in arithmetic ; you will then know how to multiply a group of twenty students demonstrating outside an office by ten.

Be careful about making speeches to learned students, i.e. from Bachelors upwards. This means that you will have to check your mind because you will find that a considerable number of students are intelligent and will not be ready to swallow your usual line of talk. If you are not confident of your ability to do this, do not make speeches to the university students : attack the problem in a different way—e.g. by seeing to it that the students who are too intelligent for your purposes fail to pass their university examinations and thus have to leave the university.

Become an expert in double-talk by reading the speeches and writings of famous and successful propagandists. Language is your best tool ; so that it is quite possible for you to claim that you are building up your country when in fact you are ruining it ; or to make yourself

out to be a great champion of liberty and independence, while you are crushing the liberty of the people and the independence of the minorities in your country. There is a vast and profitable field for you in such double-talk. It can get you out of any corner. For instance, if your people are starving because you refuse foreign aid in the building up of industries in your country, nothing is easier than to blame the food-shortage on foreign interference.

Be bold and self - confident ! Do not pay any attention to people who warn you against rashness and recklessness.

If you know how to play the propaganda game, you are safe !

But remember the truth is disastrous ; once the white light of truth shines into your hates and slogans, beware !

Nothing in excess

—In the temple at Deipki

Reading maketh a full man ; conference a ready man ; and writing an exact man.

—Framic Becon

We have no more right to consume happiness without producing it than to consume wealth without producing it.

—Bernard Shaw

M. Khadaran
F. Sc. II

Introducing Mauritius

Mauritius is a small island of volcanic origin of 720 square miles. Situated in the Indian ocean at about 1500 miles to the east of Madagascar, it is commonly known as the "Star and the Key" of the Indian ocean— as a consequence of its strategic position and of its beauty. Moreover, it is one of those countries which have just been freed from the bitter bondage of colonization, as it achieved its independence on the 12th of March 1968.

Despite its smallness, Mauritius is divided into nine districts, the largest one being 'Centre de Flacq'. One of the districts, situated in the North is the capital. It bears its name Port-Louis after the French king Louis XIV. It serves both as the sole harbour of the country and as a trading centre. The bustle of activity begins early in the moving and ends late in the night. The chief traders are mostly muslims and chinese. The muslims always daring and religious and the chinese always secretive but hard-working. For air services the island is equipped with a spacious and adequate airport lying in its southern part.

The population which is made up of different ethnic groups amounts to about 800,000 people (*Karachi already has a pop. of four million. So one can have a picture of the island's population size*) and is increasing yearly despite the persistent efforts of the Mauritius Family Planning to curb down the birth rate. The Hindus, who are in majority amount to 475,000 ; next to them comes the general population, that is to say chinese and christians. The latter make up a figure of 250 000, and the minority of the island is represented by the 130,000 Muslims.

As far as culture is concerned, we find that Mauritius has got a fusion of cultures. The Hindus are still satisfied with their Indian culture ; the creoles seem more than ever proud of their African culture and the whites at all cost maintain the western culture. (*This western culture, however, we must say, is asserting itself more and more. The young set of all the groups merge together as far as dress and mannerisms are concerned and it would be difficult to distinguish them from young europeans. Their*

way of thinking also is occident type due to the west-geared educational system and the influence of the mass-media. Ed.) Hence it is a place where takes place the marriage of East and West. Five times a day one may hear the shrilling voice of the muazzim from the minarets; on Sundays the bells of the churches answer to one another; and New Year witnesses the *cavadee* of the Tamils, the *Divali* of the Hindus and the New Year of the Chinese later on. What is more gratifying is that at a particular party one is able to see the dazzling panorama produced by the large variety of sarees, minis and maxis.

Most symbolical of Mauritius are its beaches. The chrome sand, the green filaos (*or* casuarinas *a variety of evergreen that thrives well on sandy soil and so is used to protect the beaches from sea-erosion*) and the blue sea electrify the heart of the holiday-maker with joy. And the cool air coupled with the indolent breeze from the sea usually lulls one to sleep. For accomodation purposes, are scattered here and there beautiful hotels which cater for any kind of diet, Indian, European or Chinese.

Yes, it is in Mauritius that can be seen the seven-coloured earth. It is found at Chamarel in the southern part of the country and appears like the forgotten carpet of some shah or king. Every year thousands of tourists visit this charming spot and gather specimen of the earth as souvenir. Besides Chamarel, there is also the dazzlingly beautiful Pamplemouses garden. It is the second biggest botanical garden of the Indian ocean. Therein is also found the skeleton of the first sugar mill built in Mauritius, a very crude though ingenious devicie.

The people are multilingual, but they speak French most of the time English is used as an official medium of communication. But the common language for both the literates and the illiterates remains "creole" which is some sort of bastardized French. With this lingua franca is usually linked one of the most terrifiic touristic aspect of the island, the "Sega". *('Terrific' is the word. The great attraction of this dance comes partly from the strong sexual undertone, seen in its original from, present in it. Ed.)* It is a primitive dance of African origin, firmly grounded in the folklore of the land, and loved by visitors as well.

Both Eastern and Western cultures are deeply felt. As a matter of fact, Mauritius is a musuem of cultures a theatre of languages, a sea

of friendship and a boat of unforgettabled reams.

[Though mostly accurate, the picture drawn by Mr. Khedarun is however highly idyllic. The other side of the story needs also be told for a more thorough grasp of the situation. The political climate is very unstable, to say the least. The coalition government in power since after independence, has postponed the next general elections to 1974. Meanwhile a radical leftist party has made its appearance and is actively campaining for a change of regime. It commands the loyalty of an evergrowing number of intellectuals, including the students, and is already making its power felt through recurring labour strikes. On the economic front the country is fighting a grim battle. The main foreign exchange earner is sugar, with tourism now competing for the second position with tea. (Incidentally the tea is of quite high standard and is on demand on foreign markets.) The unemployment rate is high and many new industries (soap, edible oil, shoese, etc.) have been opened to meet the situation. Diversification of agriculture and livestock farming are also being experimented with seriously. The government is also encouraging emigration to reduce the large number of educated but unskilled unemployed on its hands. All in all it is the classic picture of developing countries, and one can only wish that tiny and beautiful country the best in its fight for progress and prosperity. Ed.]

So many gods, so many creeds,
So many paths that wind and wind,
When just the art of being kind,
Is all this sad world needs.

—*E. W. Wilcox*

Ahmad Riaz Thabal
B. A. I.

To My Love

The night is dark, the wind
colder than ever; the train
Rolling on with jolts; slumber
Prevails over the moving caravan; All
Sink deep into their berths; but
My weary mind thinks on; my eyes
Glance at her; in thoughts
I recognise her; in thoughts
My beloved; what would
Happen when we part; a chill
Runs down my spine; oh! darling,
I can never leave you; never,
In all my life; my heart wrung,
My hair torn, my feet worn. I did
All to get you; how, then, can
We part, me and you; my dear,
Dear, old Suzuki.

(Ed. One wonders if Mr. Thabal is in the tradition of those car enthusiasts, or should we say 'lovers', who shed all their devotion on their glittering machines to the detriment of all else. The machine, from a means to an end becomes an end in itself. We would be sorry if this were the case).

S. J.
B.Sc. I

Our Duties Today

Today our nation is facing such a tragedy that there is no need to repeat it here. Every Pakistani is forced to think what were the real causes of this situation. We cannot find such a defeat in Islamic history. How did it happen? It seems to be something impossible. Our Army has been defeated by those who have never in history, won any war. Though it is a fact, yet our minds do not accept it. What is the real cause behind it? There may be many causes behind it. The main cause seems to be our negligence towards our duties. So, if we are determined to convert this defeat into victory, we should be active and more efficient than before, towards our duties.

The question which actually arises here is, "What are our duties? The ultimate goal of Pakistan is a sound, solid and cohesive nation able to play its destined role in the world community. This can be achieved only if we, students, are loyal and hard-working. If we develop the qualities of a student now, then only will we be able to develop the qualities of a leader in practical life. On the other hand if we want to develop our abilities and faculties, we need guidance as to ways and means, we should have a guide. Our Holy Book is our best guide. Shame on us who do not seek guidance from a God-given gift and resort to the shameful ways and customs of a corrupt west.

Now, considering the duties of students we should be very careful. Students are the future leaders of a nation. What we learn in school and college years, to a large extent, mould our ways of thinking and consequently our behaviour for life. We can never, or then with much difficulty, diverge from our developed habits. Looking ahead we can see that in the next two or three decades, the present leaders of opinion, holders of responsible posts, ranging from teachers to statesmen and including agriculture, commerce and industry big shots, will need replacing. Who will be there to fill these posts but these young people who are now in the schools and colleges? The foregoing might be a trite statement, but it can never he repeated enough. "The young-men of today will be the big men of tomorrow".

(Unless they all die young, which is highly improbable !) Hence the need, if we want good (in all the counotations of the word) leaders in all fields of tomorrow, to have good and hard-working students today.

Today, at this critical juncture, our duties have been doubled. How? Firstly we should work very hard and should be very very keen in our studies. Secondly, we should prepare ourselves for duties towards the state tomorrow. At the same time, we should also try to benefit from our studies. It was once well said, that "a graduate in chemistry cannot remove a stain from his trousers." This actually means that we do not benefit from our studies. Chemistry does not teach us to wash clothes. It certainly teaches us to tackle some incidents that occur in our daily lives. Similar is the case with Physics and other subjects.

Broaching another aspect of the subject, we find that it is the psychology of human nature, that if we respect someone, that person responds to our atitude and is attracted towards us. The majority of young men today do not respect their elders. A host of reasons could be given for this state of affairs : winds of change from the campuses of Europe and America, grievances, real or imaginary, wearing away of the traditional ties and bonds of kinship, etc. But, suppose we respect those to whom we. owe respect for instance our teachers. They will naturally come closer to us, help us more readily in our studies and generally be more helpful than otherwise. If a class has some respect for its teacher, that teacher will teach them with more interest. Thus an affiliation is developed. This case is similar to the case of two friends. One loves to help the other. Similarly the teacher will help the class. This is how they can learn more, from the experienced ones. We know how much we respect our teachers! Thank God our teachers are not of the type, who take revenge. Our obedience today will benefit us in our practical life, tomorrow. Thus we should be obedient to our seniors.

To sum up, our shoulders have been bent by our heavy duties. We should try to straighten ourselves, lest we fall. We should perform our duties with utmost skill and ardour. In the meantime we should also pray to our God All-Mighty to help us in bearing the responsibilities and in preparing ourselves accordingly for them—Amen.

Tahdith-i-Nima't

Chaudhri Mohammad Zafrullah Khan's

AUTOBIOGRAPHY

A Review

by Prof. Qazi Muhammad Aslam

Chaudhri Muhammad Zafrullah Khan's autobiography is an unpretentious and informed narrative of how the author advanced from position to position, until he attained the present high post of President of the World Court. Appropriately enough this 700-page record of Chaudhri Saheb's memoirs is called *Tahdith-i-Ni'mat* — A recital of graces received from God. Very appropriately indeed, because the reader who goes through this most absorbing story is left in no doubt at the end that hardly anything was planned or deliberateby desired, but luck came after luck and opportunity after opportunity. The author's role was that of one who would use his God-given gifts with judgement and discretion, and with courage and humility, becoming a true, practising, thinking, plain Muslim or Ahmadi Muslim. Chaudhri Saheb has been devout in his religious loyalties and emotions since his school and college days. With advancing years (now 80) he has only deepened in his convictions and commitments. Destiny made Chaudhri Saheb a companion of the Promised Messiah, on whom be peace, a devotee of three of the Messiah's caliphs in succession, and a servant of Islam and Ahmadiyyat who needed no coaxing or cajoling into the many roles he has played and continues to play in the service of the faith. A long and illustrious life, may it ever be longer !

At every turn—or better at every rise—in his career, something always happened—I mean happened to him. He never sought or contrived anything for himself. Yet offer after offer—of work, of position, of some responsible assignment came to him. Each offer meant a new rise, a new success, a new stepping-stone to something still higher. Who can narrate (or read) such a story and yet not call it a recital of God's graces ?

I I

Every autobiography has its many sides. But few could have more sides to it than this.

Outwardly or largely, a personal narrative, it is a public document of great importance. It narrates—albeit undesignedly—the history of public

events—one and all full of significance for masses of mankind and pertaining now to one part of the world, now to another, now to the Indo-Pak subcontinent, now to the Arab world, and now to the international community. It provides a key to many a major problem of our time—among them, the problem of communal dissensions which resulted irresistibly in the 1947 partition of the sub-continent. The blame for the partition it places squarely on the shoulders of Gandhi and Nehru. And how convincingly ! For only Chaudhri Saheb could tell the world what really happened at the Round Table Conferences of 1930-32 where Indian leaders—Hindu, Muslim, Sikh, Christian, untouchable, all, rajahs and nawabs besides—assembled to hammer out a workable political arrangement for a free Indian dominion. Gandhi attended the second RTC. There were meetings between him and the Muslim delegation. It was a grand opportunity. Differences were reduced to whether or not Muslims would have separate electorates. Muslim anxieties had risen to a point at which muslims—by and large—thought they must be represented in the country's legislatures by men elected by Muslims. Gandhi said he agreed, only with one provision—Dr. Ansari must agree too. Gandhi's agreement amounted to nothing if it could be vetoed by a Muslim minority group-leader of his choosing. This—it so happens—is typical of Hindu offers of agreement, of co-operation and so on. There is a way out always in reserve. In the present case it was Dr. Ansari ! Muslims like Ansari held 1% to 3% membership of the Indian Congress and Muslims were about 25% in the country. Muslims at large could not be vetoed by Muslims in the Congress. When Gandhi said he agreed with the Muslim Delegation, did he really agree ? No ! Agreeing with a way out kept in safe reserve is not agreeing. But this is only the Hindu method—they agree only with reservations. This was brought out clearly by the dialogue between Gandhi and Chaudhri Saheb which took place at one of the private meetings between Gandhi and the Muslim Delegation. If but Gandhi had played the game, the history of the sub-continent could have been quite different.

Other public events narrated in the book are the UN debates on Palestine, on the independence of Arab colonies of western powers in North Africa, and last but not least the several debates on Kashmir. The first of the Kashmir debates almost reached agreement on an immediate plebiscite. This as Chaudhri Saheb narrates, was sabotaged by a last minute intervention of the British Prime Minister, Attlee. All these are important public events about which we can read in this autobiography.

III

But there is also the personal part of the story. True Chaudhri

Saheb writes with dignity and restraint and possibly much of what he wrote has been excised by his editors to keep the volume to a certain size. Even so we have interesting sidelights on his up-bringing, on the benign influence of his parents, on his singular spontaneous devotion to his father and mother, and especially to his mother. Father, lawyer of great repute, devout muslim who learnt the Holy Qur'an by heart even when somewhat late in life, companion of the Promised Messiah, devotee of two Caliphs. Quiet and dedicated, he gave up his legal practice when he was still in the 50's to settle down in Qadian and give all his time to work for the community—honorarily of course ! Mother, a most godly woman, who led the family in all major spiritual decisions, was fortified by her own spiritual experiences, her influence reverberating far beyond the family circle. Her sympathies were wide and indiscriminating. No wonder Chaudhri Saheb writes with unique tenderness about her whenever the story requires it. No wonder he describes with special tenderness, her last days and her last moments. And no wonder, Chaudhri Sabeb's first piece of formal writing was a biography of his mother. Both father and mother, as also Chaudhri Saheb's grandfather, had the good fortune to perform the Haj. Chaudhri Saheb had thereiore two great models in his own parents.

Of the spiritual experiences and the spiritual influence of Chaudhri Saheb's mother, the present reviewer is witness. We gratefully remember the days when we lived in the same neighbourhood and benefitted from her counsels and her amazing concern in our welfare and the welfare of our children. God bless her soul ! We know of many dreams of hers which came true and we benefitted from her prayers, So, nobody need think that the spiritual experiences attributed to the great lady in the autobiography are the only ones to relate.

Chaudhri Saheb's own experiences, his own true dreams, his prayers which were accepted, and the help he received from God at all times of difficulty are besides. The book provides many examples of faith in God—faith that sustains and moves not only those whose faith it is, but also those who only live around.

I V

Chaudri Saheb's sharpness at argument became evident when he was a teenager. It must have been already evident in childhood, but Chaudhri Saheb does not tell us anything about it.

The earliest we can go, is when he had joined Government College, Lahore and the first term report on his performance had reached home.

Chaudhri Saheb himself was home for the long vacation. The report said—the boy is very good in his subjects, but plays no games! The father read the report, sent for the son and raised the subject of games. "How could I play games at college when I never learnt to play any at school? Was not my time so cluttered up from morning to late in the evening doing now this, now that that, I never could find any time for games?" said Chaudhri Sahib in reply. Father, writes Chaudri Saheb, heard the reply and said nothing. I had won my first case!

A dimension very visible in the story is Chaudhri Saheb capacity for friendship. A laudable appetite for human companionship produced a large circle of friends, not all Ahmadis, not all Muslims or Indians or Pakistanis, but people drawn from everywhere and from all classes and creeds. A good part of the narrative is devoted to descriptions of what passed between him and his friends and whatever good or ill happened to them, all this evidence of his unalloyed affection and respect for human beings as such. Among Chaudhri Saheb's friends who fill the story is Oscar Brunler, German born engineer who became settled in England.

Many of Chaudhri Saheb's other friends came to know Oscar. Chaudhri Saheb undertook a voyage to England to see Oscar and Oscar himself came to India to see Chaudhri Saheb and saw the big Ahmadiyya Gathering of the year at Qadian.

V

The book has other dimensions equally interesting. Not the least of these is Chaudhri Saheb's method—his approach in all disputes, legal or otherwise, at which he happened to assist as counsel, delegate or minister. At the Lahore High Court, he built himself the reputation of a case-winner, and this inspite of judges who remained hostile throughout. The present reviewer distinctly remembers a Chief Justice paying tribute to his legal succeses (this was at the grand dinner hosted by his friends on the eve of his departure for the Government of India) humourously describing Chaudhri Saheb as a danger to the law courts! Good for them that he was going away! How did Chaudhri Saheb do it? There is material enough in the book to answer this question. It relates not only to his work as advocate in court proceedings, but also to his work as negotiator, statesman and member of the inner circles of the international community. What Chaudhri Saheb seems to do is to concede whatever—by rights or by logic—must be conceded to the other party. So good would be the impression created on the judges in the tribunals or the other parties

concerned, that often they would in return concede to Chaudhri Saheb even more—often more—than his part of the case.

V I

The autobiography *Tahdith-i-Ni'mat* is a great book : it should live as such to inspire generations of readers. It is a massive addition to Chaudhri Saheb's already very considerable literary output. His *English translation of the Holy Quran* (Curzon Press) his book *Islam* (Kegan Paul) and his two books *The Prophet at home* and *Islamic worship* are already on the shelves of readers in many parts of the world. His autobiography will join the august company and make it more august than before.

Published by : Dacca Benevolent
Association, Dacca.
Price not stated.

There is no duty we so much underrate as the duty of being happy.
—*R. L. Stevenson*

I disapprove of what you say, but I will defend to death your right to say it.
—*Voltaire*

Behold, I do not give lectures or a little charity,
When I give I give myself.
—*Walt Whitmah*

Waseem Ahmad Khan
(Old Boy)

To the Past : Quo Vadis

To-day we are passing through one of the most critical stages of our history. The debacle in East Pakistan and the cease-fire in the West, have created a chaos in the Pakistani nation. The enemies of our beloved motherland, who were slapped in 1965, have again raised up their heads.

At present we have only one aim in front of us, and that is to build up a stronger and greater Pakistan.

India has attacked Pakistan thrice since the latter's birth, but she has always stood against all odds. We will again stand up, if summoned, like rocks. The present set-back, is due to some unfortunate circumstances, and is only temporary. We cannot give away our Golden Bengal to India. 'Hamar Sunhar Bangla Desh". We follow this slogan. We did it again in the Security Council on the 15th of November. We appealed to the world to stop Indian aggression in East Pakistan, but alas! The Council took no notice of it. The world committee was in a jest and was ironical. There was mockery on their faces. "Mr. President, we will fight for a thousand years" (President Bhutto), was and is the voice of our nation.

Therefore, now is the time for us to sink differences and get united, to leave aside politics and get up to build up the country for which so many beloved ones have been sacrificed. Morally, physically and economically we should contribute all of us to the task of nation-building. Gentlemen, we lack nothing except the will to go forward. We cannot expect Martians or Moonmen to come down for this job. It is we who have to work for the integrity, prosperity, and in short for the bright future of our nation. There are certain people who do not work; instead they run up a hog trail which finally meets a squirrel track, that runs up a tree and finally ends in a knothole. Such people are lazy and work on the principle of procrastination which is a time thief. The real and supreme goal of our lives is the prosperity of the human race and of our country. We need

'friends but not masters'. We may take aid from foreign countries, we welcome it, but then only if it does not have stings (strings) attached to it.

As for the students, they should quit politics. Why go on jingling like tools and toys in the hands of the different political parties. Instead they should work on their studies. These strikes, taking-over of colleges, buildings etc., breaking and damaging of property, are only means to our destruction. Are we not destroying our own country instead of building it? We should not indulge in such activities. We need calm and quietness. We need peace and prosperity. No strikes, no take-overs, but work and harder work than ever. My dear student-friends, our fighting field is our studies. The harder we strive to gain knowledge, the better it is. It is here that we should win our Nishan-i-Haider, our Hilal-i-Jurat and other gallantry awards, and not by brick-batting the police and damaging property. We should never listen to political leaders because they are always mad after posts. They play with our careers. I will tell you a nice bit of a joke. During a recent journey by air, an elderly lady advised me never to listen to political leaders. She said, "When I see a man trying to be a political leader, I visualise a pup trying to follow four different school-kids at the same time." So let us not be puppies.

Now a word about the World Organisation. You are all aware that the United Nations has failed lamentably. Why?.....The answer is that it is only a wee willie winkie in the hands of certain powers who have vested interests in it. That is why the Security Council failed to pass a resolution checking the indian aggression for a week, and then after Dacca had fallen, the delegates walked away. We have received no justice from the so-called 'justs'. We have been beguiled and deprived of our rights. God bless you United Nations.

In the end, I would strongly advocate the principle of hard work. When we work sincerely, we prosper. Let us for God's sake join hands now. Leave aside these strikes and take-overs. Put them in a bag and feed them to the dogs. Let the dogs be on strike, not men.

We are muslims. We trust in God Almighty. Then let us take the spade and dig for the coveted gold. God will help us and inshallah we shall prosper.

Pakistan Paindabad.

Ch. Muhammad Zafrullah Khan

Law, Society and the Individual (Cont.)

In this second and last instalment to his thought-provoking and refreshing article, Chaudhry Saheb proceeds to analyse the world wide revolt of youth against society and the established order, and concludes with a suggestion (a strong one) for a solution to the whole chaos.

In the meantime the hazard of moral disintegration of society continues to mount and the gulf between the generations is widening rapidly. Youth and age are at cross purposes.

The Times of London, in a leading article criticizing the severity of a sentence imposed by a judge in a case of unlawful possession of a drug observed that the younger generation in Britain was posing a challenge to the older generation in that the older generation was addicted to liquor and gambling and the younger generation was becoming addicted to drugs and sex, and concluded with these four shattering words :

".....and these are safe." This ostrich-like attitude towards major problems confronting society and the individual is disturbing. The leading and at one time highly respected, organ of a great country is expected to be more helpful in its major pronouncements that that it should abdicate its responsibility in the face of the moral crisis confronting the community and take shelter behind a pronouncement which offers merely a choice between different methods of national suicide. We must recognise the truth that liquor, gambling, drug and sex, each one through abuse, can become a curse and that such abuse must therefore be utterly and absolutely shunned and discarded.

James Michener, writer and publicist, concluding his interpretation of the tragic events that happened on the campus of Kent State University in Ohio in the first week of May 1970, in his book "Kent State : What Happened and Why" has stated :

> "What has caused this worldwide revolt ? The single best explanation is that the young have rejected the life-styles

of their parents and have committed themselves to a life-style they have been developing over the last two decades. If one fails to see that the revolts in Japan, France, Venezuela and the United States are identical in every aspect that matters, one misses the whole point of what is happening in the world.

It is obvious that a major responsibility of society to-day is reconciliation of young people and the old. The radical divergence between life-styles—the vast differences in dress, cleanliness, hair-fashions, attitudes towards work, politics, music, religion, patriotism and sex—must not crystallize into permanent alienation. This does not mean that the older members of society have to surrender values which they have inherited and which they cherish. It does mean that there must be some understanding of what the young are trying to accomplish, It is crucial that older people do not reject them automatically. The older generation should acknowledge that the young have raised legitimate issues in their protest against war, in their concern about ecology, their determination to end racism and to find new meaningful occupations. Dress, music, idiom, the length of hair and new dating practices are matters of style, which change from generation to generation. Older people should not allow themselves to be irritated by such trivial things. Drugs, delinquent sex habits, violence, go much deeper than style and must be opposed where they are known to be destructive. But the older person should be able to distinguish between the two.

.....It is obligatory that young people also make concessions. Specifically they should.

1. *Act within the law.* The correction of legitimate grievances must be achieved in legitimate ways. The slow building of our democratic process required both moral commitment *and* patience. Society is going to demand that students comport themselves more responsibly. Arson, incitement to riot are crimes, and persons guilty of them should go to jail.

2. *Respect the moral convictions of others.* Young people are not obligated to pay allegiance to any church, but they ought not to ridicule those who do. Sex, it should be recognized, is a private occupation. Actually, many older people approve of the new morals, but they do not care to have them flagrantly promenated in public.

3. *Reject obscenity as a weapon.* By their abusive language, young people have outraged sensibilities and made communication with others difficult, if not impossible. Nothing is gained when, in addition to pressure on such issues as the war and the draft, deliberate obscenity is offered as a challenge to the rest of society.

No wealth in this country is more valuable than the burgeoning talent of a new generation, and no expense is too great to cultivate it. The continuity of life is precious. The young need older people to argue with, to test their ideas. The old need to take hope from the young, to feel that civilisation will contime to advance.

A few weeks before the shootings at Kent State, Jerry Rubin, radical leader of the American Youth International (Yipples), told a crowd of Kent students, "The first part of the Yippie program is to kill your parents." A few days after the shootings, the parents of hundreds of student who had escaped the bullets of the National Guard told their sons and daughters: "You should have been shot."

If we are not to commit national suicide, all of us young and old, must condemn such extreme emotions. Then with humility, love and understanding between the generations, we must begin to heal the wounds they have left."

A fortnight back Mr. H. Moorkerk, of the Youth Consultation Centre in Amsterdam, who himself has long hair and hippie style shirts, stated that the number of youth "droupouts" in modern society is increasing. He said the Amsterdam authorities were trying to create an atmosphere in which dropouts could unburden themselves of their problems.

According to him there had recently been an estimated increase in youthful dropouts from 15 to 20% of the total of young people and

their main problems had been, on the one hand a straightforward lack of housing and food and on the other hand a complete lack of contact with society. This had resulted in apathy, loneliness and eventually crime and drugs. In these circumstances, groups of dropouts tended to form an aggres ive community. Out of sheer frustation they went into the streets, armed with bicycle chains, to cause trouble and this had led to clashes last year between young people and the Dutch Police.

Mr. Moorkerk said modern Dutch policy was to create an atmosphere of confidence for young social dropouts. When they came to the Youth Consultation Centre they found an atmosphere that was congenial. They could talk about their problems while they were among other "hippie" personalities and to the sound of beat music they could explain their problems. In very many cases, he said, social assistance was available for the asking. But such was the state of apathy of many young people today that they did not even take the trouble to apply for social support. This therefore required, in his opinion, active intervention by the authorities to seek out youthful dropouts in order to reintegrate them into society.

In all this welter of current and cross-current law is beginning to be tossed about like a rudderless vessel, yielding to clamor rather than setting a purposeful course and steering steadily towards a goal approved by reason and justified by experience.

The normal sanctions behind law are losing their force. Humane considerations have quite rightly but not always wisely, operated to soften their physical terror and vigour, and this has served to reduce their degree of of deterrence, but they are being seriously undermined through subjection to ridicule and contempt. Breaches of certain sectors of the law are loooked upon and even applauded perversely as proof of moral courage. The whole edifice of law and order is thus being corroded at its foundations.

One powerful deterrent against breaches of law and of the moral code has been the fear of the loss of the esteem of one's fellow beings. Today certain types of wrongdoing are viewed with amused tolerance as daring protest against what is called hypocrisy or double standards. The truth, however, is that wrongdoing is no longer regarded as symptom of moral disease or disorder and over a broad range breaches of the moral code do not entail loss of esteem or respect. This kind of tolerance or

indifference is symptomatic of a creeping moral paralysis. Society seems to be headed towards a stage where good behaviour, orderliness, conformity to and respect for law are likely to be looked upon as indices of weakness and lack of spirit rather than as indispensable foundation of a healthy and vigourous social order.

It is often said that the tendencies to which I have drawn attentions are only evidence of the exhuberant energy of modern youth which should justify great expectations and high achievements that youth gives promise of compassing once this tremendous upsurge of energy is directed through proper channels and that, rather than generate concern, they should furnish cause for joyful anticipation of the brilliant era of positive accomplishment in every sphere of life that is about to burst upon us. At the same time it is also urged, somewhat contradictorily, that these tendencies are confined to a small section and that that they exhibit a phenomenon which has periodically found expression at certain stages in the social history of man and that they contain within themselves the seed of their own decease. The first attitude results from lack of clear thinking and the second signalizes mental apathy or perhaps some degree of atrophy of the thinking faculty.

It is true that in the sphere of science and technology the tremendous achievements both of thinkers and of actors are a matter of just pride for the human race. The implications of that which has been achieved, and it looks as if it is only the beginning, are immeasurable, and that of which promise is held out is limitless. It needs to be observed, however, that all the achievement is an indication of the heights to which man is capable of climbing by the exercise of h s intelletual and other capacities and faculties. The tendencies to some of which I have drawn attention this afternoon, reveal glimpses of the moral abyss into which man is liable to tumble or be pushed unless these tendencies are brought under strict control and regulation. Another observation that has pertinence is that there is no evidence that addiction to liquor, gambling, drugs and illicit sex has stimulated scientific and technical achievement. Each of these is destructive of human personality. In the case of liquor and drugs, the finest and most delicate human faculties are the first to be damaged. In view of this contrast all that can be asserted is that we witness to-day a demonstration of the truth that man has been endowed with faculties and capacities through the right and proper use of which he can rise to hither

to unmeasured and unconceivable heights and by misuse or abuse of which he is liable to fall to the lowest depths of degradation. It is an awesome reflection that the choice lies with him. There is no compulsion.

I do not know to what degree I have succeeded in setting forth some of the factors that underlie my anxieties but I trust that some of you may have perceived a reflection of them and I am hoping that many of you have already engaged in thinking out and working out the necessary correctives and safeguards which would ensure the security of the human race in all respect so that it should march forward to and up the heights rather than slide down the slope of Avernus.

Have I any suggestion in that behalf? It would not be fair, perhaps it would not be right and certainly it would not be true if my answer to that query were to be a simple negative. I would, in addition, be guilty of having occasioned a waste of your precious time if I had merely drawn attention to some of the disorders afflicting us, whose virulence is being rapidly augmented and intensified, without even a hint at a remedy or a possible source to which recourse may be had not only for comfort but for cure and salvation.

I am convinced, and I proceed to give expression to that conviction, though I may be in minority of one in holding to it, that at the bottom of the manifold ills and disorders from which human society suffers today and to which it is a prey, is the lack of a living and life-giving faith in a wise and beneficent Creator. When I say that I do not mean just lack of religion in the sense of doctrine, dogma, worship, ceremonial and even polemic.

Religion as such is suffering today in the same way as morality, for morality has its basis in religion and is the practical expression in daily life of one group of religious values. Religion too is fighting a rearguard action in this age and is being gradually but continuously pushed back. Today man is not only reluctant but is unwilling to commit himself to or identify himself with anything that cannot be subjected to the test of experience. He will not be persuaded to invest his all that pertains to this life on the promise of discovering after he has passed out of it that he had made a truly profitable investment. For in a such case he runs the risk of discovering, when no chance of a retreat or retrieval is left open, that he had made a wrong choice and that his investment

has been a total loss.

It is only such faith as is capable of yielding beneficence in every sphere and at every step of his existence here to which he could be persuaded to commit himself wholly in the conviction that he will thereby secure for himself the certainty of a hereafter of continuous increasing beneficence through eternity. How simply has this verity been expressed in the phrase : A tree is known by the fruits thereof.

Such faith can be based and built upon and strengthened not merely with belief in the existence of a wise and beneficent Creator but with experience of Him, which is the ultimate reality and against which no argument can prevail.

Science and technology do not in any manner militate against such faith. The simple truth is that increasing knowledge of the laws of nature and greater experience in the method of the application of those laws in serving and fulfilling human needs is in itself a divine bounty which needs to be appreciated as such. The universe, of the vastness and grandeur of which even today man has but a faint concept, is not man's master but man's servant. Man has been granted dominion over it in the sense that through the exercise of the faculties and capabilities with which he has been equipped by a beneficent Creator, he can progressively, through his growing knowledge of the laws of nature, increase his mastery over the forces of nature.

It is a dangerous fallacy which has done tremendous harm to pretend that there is, or there can be, any conflict between science and religion and then to seek shelter behind the utterly false notion that each has its own distinct sphere and should not intrude upon the other. This mode of thinking has contributed largely towards reducing religion to a hollow shell, almost empty of beneficent content. It is the function of true religion to furnish guidance in all spheres of life and to set forth a standard of values which should help to make life on earth totally beneficent in all its aspects, The law of nature is part of the divine order which regulates the universe and all that pertains to every aspect of life. There is no conflict or contradiction between different parts of the divine order. All is beneficently adjusted. Discord is introduced when man deliberately makes a wrong choice.

In the divine order man has been assigned a place of honour. He has been granted dominion over the universe and is furnished with guidance through revelation which has always not only kept pace with man's needs but has kept ahead of his needs.

All divine attributes are in operation all the time. The deepest yearning of the human soul, communion with the divine, has throughout been attainable and is attainable today as it has been attainable at any time in the past. God speaks today to His creatures as He spoke of yore, and will continue to speak. He hears today as He heard of yore and will continue to hear. God never turns away from man, it is man who in his pride and arrogance often turns his back upon God. He is doing so today not only in conduct, as he has often done before, but also in word, to a degree which he seldom if ever dared before. Man has been familiar through the ages with the assertion on the part of some of his fellow beings that there is no God. It is only today that he is beginning to be told that there was God but that He has died, as an historical fact in our age. A large sector of those whose creed is formulated as : God is dead, are unfortunately professors and teachers in religious seminaries where hitherto their business has been to teach and to inculcate faith in the existence of a Wise, Beneficent, All-Powerful Li≤ng God.

At the bottom of this alienation of man from his Creator, already widespread though not so acknowledged, is arrogance born of man's pride in his so-called achievements. It is a curious phenomenon that this arrogance exhibits itself not among those who are primarily responsible for this achievement, but among those who are mere lookers-on but who feel free to philosophize about it. The prevailing attitude of the participants in and promoters of this tremendous upsurge of achievement, with only a few exceptions, is one of awe and humility. They are steadily advancing towards a better appreciation of God's limitless creation and a deeper insight into the quality and richness of the capacities with which God has endowed man. This impels them towards seeking that closer communion with the divine which is the ultimate purpose of the creation of man and which divine mercy and grace have put within the reach of everyone of His creatures.

The realization that every human being, without exception, has

been created with that purpose and is capable of achieving it, is the key towards the solution of all our major problems. This should be a powerful stimulant towards that understanding, that sympathy, reverence towards every other human being which could eliminate conflict and disorder and should usher in an era of intense activity in co-operation and competition, reaching out towards universal beneficence.

Nature has furnished the means, science and technology are extending far and wide the knowledge of the fashioning of and of the methods of application of the instruments needed to that end, and divine guidance has been made available afresh, if only we had the urge to look for it, which would serve to make human life on earth richer, fuller and happier than man ever has had any concept of. The choice belongs to man. He can choose beneficence and life. He can delude himself into ruin and death.

I am no prophet of doom. Nor is that which I have just said a mere counsel of perfection, in the sense of an idealistic, impracticable blue print for thought and conduct. It is a counsel of perfection in the sense that it emphasizes a priority of values sorely needed, and its practicability has been widely demonstrated in this our day and time.

There are today individuals, families, groups, small communities scattered far and wide around the globe, in every region and every clime, not withdrawn from the world, participants in the activities, pursuits and occupations of their fellows, whose experience of God is the light in which they walk, is the air which they breathe, is the nourishment which sustains them. This is true of their men and their women, of their old and their young.

To the eye of a superficial observer they are not markedly distinguishable from the general run of their fellow beings, and yet they are a class apart. In this last third of the twentieth century they have made the seeking of divine pleasure and the doing of His will in all things their supreme purpose. Yet they have not been found wanting in any respect in the discharge of what society regards as secular duties and obligations. Indeed, they appear to possess the quality of outstripping their fellows in every beneficent activity.

Those among them who may be accounted poor in worldly possessions are rich in their continuous experience of God and are respected and revered accordingly. Those who may be accounted rich in respect of

material resources are eager to share them with whose may be in need and consider themselves under obligation to serve their fellow beings in every situation. All are pledged to uphold the primacy of spirital and moral values in every sphere of life. Among them humility is accounted a cardinal virtue and arrogance is shunned as a deadly sin.

They are a close knit but daily growing human brotherhood, devoted to seeking the pleasure of their Maker through service to His creatures. Their material concerns are pursued with diligence and integrity but these do not beguile them from the constant remembrance of their Maker. They seek His guidance and help constantly through prayer and are steadfast in this pursuit. Among them the only badge of honour is the piety and righteousness of a person's life. They keep exhorting each other to do good and to shun evil and are eager to outstrip each other in this endeavour. Their young revere age, hold it in honour and deem it a privilege to serve and obey their elders. Their elders cherish their young, watch over them and seek to guide them along the paths of purity, modesty and righteousness.

They honour every human being as a creature of their Lord, and have no more regard for the colour of his skin than for the colour of his coat. There are among them no divisions, no grades, no classes.

This is not an overdrawn or oversimplified picture, though it may appear such to those whose cultural values have been cast in so artificial and rigid a mould that any departure from them srikes them as odd and incongruous. Yet this very rigidity and artificiality have provoked the widespread revolt of youth which perplexes the older generation. The only remedy is reversion to the simplicity and reality of fundamentals in theory and in practice, in thought and in conduct.

I conclude with the prayer that we may be blessed with the insight and the courage to recognise and choose life and with the steadfastness needed to pursue it and to live it in utter beneficence.

My last word is that all worthiness of praise belongs to God, the Lord of the worlds.

Khawaja Atta-ur-Rehman
F.Sc. II yr.

Miracles or What?

Allah Almighty shows miracles or great signs so that his creatures may think about his greatness, omnipotence, etc, and follow his directives. The incident which I am going to relate, is one of the most surprising I have experienced until now.

Some children were playing near our house. My younger brother was also there, and he was a personal witness to the happenings. There was a well in the yard around which there was no ridge. That well was normally covered by a plank, but at that time it was uncovered. A few moments later, a boy, the only son of his parents came round, peeped into the pit, and the next moment.....he tumbled into it. How it all happened we do not know, but anyway that is beside the point. The other children did not know what had happened, for when they heard the noise of falling they thought that some brick had splashed in, and had dismissed the incident.

Then someone suddenly said, "where is Pupoa?", and when they realised that he had been standing on the plank they knew without doubt what had caused the falling noise. They all at once started crying and shouting. The mother of the child came out of hand. She even wanted to jump into the well and other members of the family had to restrain her physically. It was a thoroughly plightful scene.

Now it so happened that the adjacent house was under repair and when the workers there heard the sudden and usual noises, they at once came round to investigate the cause. On being told of what had occured, they promptly found a rope. One af them got hold of one end of it, and went down the well while his comrades fed it to him gradually. When he reached the surface of the water, he turned round, scanned and reported that he could see no one inside. At this the suspense and drama of the situation was further increased.

He was lowered a bit more, and lo!.....his leg hit the head of the

child. He picked him up at once and found that he was neither drowned nor showed any sign of fear on his face. It seems that he fell straight in, his feet hitting the water first, aud remained floating with his head above the water-level. Meanwhile the men up, had started hauling in. They had to do it quite slowly so that the child might not be shaken off the back of the man by the jerks. Everybody was waiting anxiously and praying humbly, and when the child was brought out of the well, the outburst of joy was general. I cannot really express the feeling of those present at that time. It was a strange mixture of crying and laughing.

The mother at once snatched the child and ran with him to the house, kissing him a million times, thanking God for her good fortune—there was not even a minor injury to the child. The latter then spoke up and said to his mother, "one of my shoes remained in the well". Did she care about a shoe? I am sure that mother would willing have given a thousand shoes and more for her son. And these simple words, spoken so innocently, must have made her realise how dearly she valued the life of her child—above everything else. (A lesson perhaps for those of us, parents or bigger brothers or sisters, who illtreat children and can afford to forget all they represent to us and what amount of care and affection they need).

It was a great sign of the Most Gracious and Protector, and to-day while I am telling this story, my heart is over-flowing with a strong feeling of thanks to Him.

[Of course many people would attribuue this incredible escape and the like to "good fortune" or "circumstances" or some similar reasons. This in turn raises the question, "What is a miracle?" and "Where lies the line separating miracles from everyday happenings?" If we pray to God for something and that something does in fact come to pass, then does this constitute a miracle? *Ed.*]

There is a tide in the affairs of women,
Which taken at the flood, leads—God knows where.

—*Byron*

M. S. Gassama
B.Sc. I

The impression of most Pakistani Youths about Africa and the Africans

Since my arrival here many questions have been asked me by my Pakistani friends about the continent of Africa and the African people. These questions have no doubt given me the impression that either most of my friends know very little about Africa and the Africans or that they have had the wrong information about that continent and its people or that some of them deliberately feel that whatever the Africans might do, Africa should be what they feel it is.

My fellow Africans at the Jamia, at Lahore, and at Lyallpur hold similar views with me, since most of them have been given tne task of answering similar questions. I must, however, make it clear that I am not writing with any emotion, but simply making an attempt to answer some of the many questions which have been put to me so as to give a brief account of Africa and of the Africans.

Q. Is it true that Africa is a very hot continent?

A. In the first place, this is a question which covers the whole continent of Africa ; therefore it cannot be true. Africa is a continent that extends from about Latitude 32° North of the equator to about Latitude 32° South of the equator. Geographers hold the belief that most of the countries lying on the equator or within the tropics are usually hot during summer. The earth as we all know is spherical ; this then means that the equator goes round the earth. If the above question is true, then one will be right to conclude that the equator only stops within the continent of Africa and does not in fact go round the earth. This, however, contradicts the geographer's belief and hence the above question is not warranted. There, is no doubt that there are countries in Africa on the equator or within the tropics. These countries, however, unlike Pakistan, have had the blessing of having grasslands, bushes and even forests ; therefore most of the

heat of the sun is being filtered down by the branches of trees thereby decreasing the intensity of the heat of the sun reaching the people ; one can therefore see that even those countries which lie within the tropics are not as extremely hot as some parts of Pakistan. Those or most of those countries lying south of the tropics like South Africa, are relatively cool. Moreover most African countries situated in the equatorial or sub-equatorial zone, enjoy unlike Pakistan, a high amount of rainfall, which helps keep the temperature down.

Q. Why are you black ? Is it due to the extreme heat of the sun in Africa ?

A. From this question, one can conclude that anybody asking such a question, is infact saying that the colour of a man is determined by the type of climate in which he lives. If this question is true, what then can we say about the Arabs in Egypt, Libya, Morocco etc. ; are they black ? What abouts the whites in Rhodesia and South Africa, are they black ? What about those Pakistanis now resident in Africa who have given birth to chiildren and the children are now grown ups ; those children will surely come to Pakistan with a completely black skin. What about those of my African friends who have spent six years here in Rabwah ; their skin must by now be changing to brown. These are just very few examples to illustrate to my Pakistani brothers that the colour of a man does not depend on the type of climate in which he lives ; rather it is inherited from his parents and whatever change of climate he might experience, his colour will remain the same.

Q. I have heard that people stay naked in Africa ; is this true ?

A. Before answering this question, let me first of all quote part of the sermon which the supreme head of the Ahmadiyya movement, His Holliness Hazrat Khalifatul Masih III, gave on the Friday he immediately returned from his West African tour :

"Another quality that those people possess is their great concern for cleanliness.

In short, they are very clean and so very particular about cleanliness that throughout the six countries I have travelled wherever I came across a water shed, I saw Africans busy in laundering their dressess." If the people of Africa are staying naked then they must nave been laundering their skins. Huzoor could not have been wrong in saying that whenever he came across a water-shed, he saw Africans busy launder-

ing their dresses ; This alone should have been enough to convince my Pakistani friends that Africans do not stay naked. The other point I can advance to support this view is that African countries like other developing countries are looked upon as a good market for the European manufactured goods ; because of this, one can expect a competition between the European countries for their goods. In the course of this competition, priority is given to quality, since poor quality means less demand for such goods and therefore a great loss to the european countries concerned. One can therefore see that Africans do not only put on dresses but put on the best manufactured dresses in the world.

Q. Africans feed on human beings ; is this statement correct ?

A. Assuming that the above statement is true, then the continent of Africa should have surely by now been deserted. If it is true that Africans feed on human beings then what is the fate of the Pakistani business, doctors, teachers and missionaries now in Africa ? They should have very little hope of returning home, as they could serve as a very delicious breakfast for the Africans. However, most of you have seen your relatives, and friends going to Africa either as missionaries, doctors, teachers or as businessmen and returning home safely ; most of them would even like to go back to Africa if given the opportunity. Since these Pakistanis go to Africa and return home safely, then those Pakistanis who still hold the belief that African feed on human beings should now be convinced that Africans do not feed on human beings ; rather we feed on animals both wild and domestic, as the former abounds in our fine tall grasses, bushes and forests.

Q. I have learned that you come from Sierra Leone ; is this country in Europe ?

A. This question gives me the impression that most of my Pakistani brothers do not only know very little about Africa, but even seem to know very little about the rest of the world. Assuming that Sierra Leone is of very little importance and therefore he could not have known its position on the world map, my black skin and other features should have made him have a second thought before asking such a very question. If I were to ask such a question, I would have put it in this way : Is Sierra Leone in Africa, in U.S.A. or is it part of the Fiji Islands ? since in these places one can find people of features similar to mine.

Q. You say that there are Degree Colleges in your country ; why then did you come here for your degree course ?

A. Very recently, while I was reading the British Review, I came across the statistics of foreign students studying in Britain, and it was stated in that review, that out of the total number of foreign students studying in Britain, the largest quota came from Canada, the second largest from India and then Pakistan and some countries in Africa. Does this mean that there are no Degree Colleges in Canada, India and Pakistan ? It simply means that one does not only leave one's country purposely for getting all the degrees from a foreign land. Going out to study in a foreign land gives one a better chance of meeting with quite a different race and a better chance of studying their culture properly. This in itself is a great academic achievement in addition to what one gets from text books.

Q. People in Africa stay in trees ; is this statement correct ?

A. Suppose this statement is true, then we can as well conclude that our friends from Europe, Asia, Canada and U.S.A. working in Africa stay in the most beautiful trees. One then wonders why can't those foreign friends return at once to their respective homes to enjoy their beautiful buildings, but prefer to stay longer in Africa to enjoy the comfort of sleeping among Africans. The fact that most of these foreign workers even wish to return to Africa to work for a longer period of time is a clear indication that they are denied those comforts at their homes which they normally get in Africa. Africa like any other continent, contains countries and these countries contain cities, towns and villages. In the cities and towns you always find the most modern buildings of our time.

Any person under the age of thirty, who, having any knowledge of the existing social order, is not a revolutionist, is an inferior.

—Bernard Shaw

Students Union Tally for 1971-72

The direction of the Union reports that it has had a successful year, and has bagged eight trophies and thirty individual prizes, an all-time record. The details are as follows :

Urdu Debates

Trophy from Preme Sati Trost College, Kamalia
First Prize : Abdul Karim Khalid
Third Prize : Laeeq Ahmad Abid

Trophy from Muncipal College Bhalwal
First Prize : Abdul Karim Khalid

Trophy from Muncipal Degree College Mandi Bahauddin
Second Prize : Abdul Karim Khalid
Third Prize : Laeeq Ahmad Abid

Trophy from Government College Tala Gung
First Prize : Laeeq Ahmad Abid

Trophy from Muncipal Degree College Hafizabad.
Third Prize : Abdul Karim Khalid
Consulator Prize : Abid Riaz Maliq

Individual Prizes

Abdul Karim Khald
2nd Prize from Govt. College Sargodha in Seerat Conf.
Third Prize ; from Muncipal College Mandi Bahauddin in Seerat Conf.

Laeeq Ahmad Abid.
2nd Prize from Muncipal College Gojra
3rd Prize from Islamia College Lyallpur
3rd Prize from Islamia College Gujranwalla
2nd Prize from Mandi Bahauddin in Seerat Conf.